Women Writers'
Classics

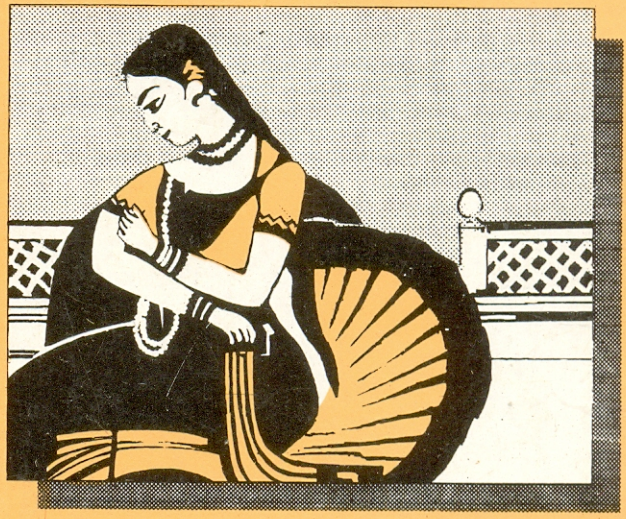

خاکے

میرا کمرہ

امرتا پریتم

RHOTAS LPS
Low Priced Series

میرا کمرہ

امرتا پریتم

روہتاس بکس

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت اول	1992ء
پرنٹرز	نفیس پرنٹرز پیالہ گراؤنڈ لاہور
پبلشرز	روہتاس بکس احمد چیمبرز - ٹیمپل روڈ لاہور

Rs. 36/=

شوکت عثمان 1917

میری پیدائش 2 جنوری 1917ء کو ہگلی ضلع کے سبل سنگھ گاؤں میں ہوئی تھی۔ میری قلم کو 1930ء کی جنگ آزادی نے جلا دی تھی۔ نظم سے نثر کی طرف مراجعت کی۔ 1946ء میں پہلا ناول لکھا۔ ماں! لیکن اگلے برس جب ملک تقسیم ہوگیا، مجھے بنگلہ دیش جانا پڑا۔ وہ ناول وہاں شائع ہوا تھا، 1949ء یا 1950ء میں۔

وہاں ڈھاکہ میں اپنا گھر بنانے میں کچھ برس لگ گئے۔ 1954ء میں گھر بنا سکا تھا۔ اپنا لکھنے کا کمرہ بڑی چاہ سے بنایا تھا---- چھوٹا سا تھا، صرف بارہ فٹ، بارہ فٹ کا۔ اس میں بچھایا ہوا دیوان میری لکھنے کی نشست بھی تھی اور میرے سونے کی کھٹیا بھی۔

کمرے میں قریب چار ہزار کتابیں تھیں، چھت تک چنی ہوئیں۔ کمرے میں ایک پینٹنگ تھی۔ مجھے قدرت سے عشق ہے---- اس لئے وہ پینٹنگ ایک لینڈ سکیپ تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں ایک چھوٹی سی میز تھی، میرے لکھنے کے لئے، جس کے برابر ایک ریکارڈ پلیئر رکھا تھا اور کچھ منتخب ریکارڈ۔ جس کی دھیمی موسیقی میں لکھتے وقت بھی سنتا تھا اور کتابیں پڑھنے کے وقت بھی----

کمرے کی چار دیواروں میں سے دو بالکل کھلی ہوئی تھیں، بڑی بڑی کھڑکیوں والی اور دوسری دو دیواروں کے ساتھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں، چھت تک۔

بس، یہ کمرہ تھا---- جو میرے جیتے جی تاریخ پارینہ کا حصہ بن گیا ہے۔ اس کمرے کو اور گھر کے باقی حصے کو خدا کے حوالے چھوڑ کر میں اور میرا کنبہ

1971ء میں وہاں سے نکل گئے تھے۔ بنگلہ دیش میں 25 مارچ کی آدھی رات کو پاکستانی فوجیں شہر میں آگئی تھیں' اور ہم سب اپنی جان بچا کر گاؤں گاؤں گھومتے رہے---- اور 5 مئی کی آدھی رات کو سرحد پار کر کے ہندوستان کی سرزمین پر آگئے۔ ہندوستانی فوجوں نے بڑے کرم سے ہمیں کلکتہ پہنچنے میں مدد دی۔

کلکتہ میں ہمارا سارا خاندان بنگلہ دیش کے آزاد ہونے تک رہا۔ میرے چار لڑکوں میں سے ایک مجاہد آزادی ہے---- وہ بنگلہ دیش کی اور ہندوستان کی افواج کے ساتھ مل کر لڑتا رہا تھا۔ باقی ہم سب کلکتہ میں تھے---- 16 دسمبر تک جب پاکستانی فوجوں نے ہتھیار ڈال دیئے تو ہم آزاد ہوئے بنگلہ دیش میں واپس لوٹ گئے تھے۔

ہم اپنا جو گھر خدا کے حوالے چھوڑ آئے تھے' خدا نے اس دیواروں اور چھت کی حفاظت کر لی تھی' لیکن گھر کی کسی بھی چیز کو وہ لٹیروں کے ہاتھوں لٹنے سے نہ بچا سکا تھا۔ جا کر دیکھا---- سارا گھر لٹا ہوا ہے' صرف ایک لوہے کا پلنگ پڑا ہوا ہے اور چھت تک چنی ہوئی کتابیں---- وہ شاید لٹیروں کے کسی کام کی نہ تھیں۔

مجھے ذاتی طور پر ایک بات کا گہرا افسوس ہوا---- 1970ء میں' میں جب ایران گیا تھا تو وہاں ایک شاعر نے مجھے عمدہ شیرازی شراب کی ایک بوتل تحفتاً" دی تھی۔ وہ شیرازی میں نے بہت سنبھال کر اپنی لکھنے کی میز کے ایک خانے میں رکھی ہوئی تھی کہ کسی بڑھیا موقعہ پر اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اس شراب سے جشن مناؤں گا۔ جا کر دیکھا' وہ شیرازی بھی لٹیروں نے پی ڈالی تھی۔

خیر' تب تک میرا ایک ناول چھپ چکا تھا---- "کریت دا میرہانسی"---- جس کے معنی ہیں' "غلام کی ہنسی"۔ اس کو' آدم جی ایوارڈ' مل چکا تھا۔ وہ ایوارڈ بھی ایک عجیب حادثہ تھا---- چھ ججوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا' سو ایوارڈ مل گیا تھا۔ لیکن بعد ازاں جب لوگوں نے اس ناول کو غور سے پڑھا تو اس کا طنزان کی سمجھ میں آگیا۔ وہ اس کو ضبط کروانے کی کوشش میں رہے اور بہت دنوں تک یہ سوال ماحول میں تلخی گھولتا رہا----

15 اگست 1975 کو جب بنگلہ دیش کے پریذیڈنٹ شیخ مجیب الرحمان کا قتل ہوا' میں جان گیا کہ فوجی حکومت کے تحت رہنے کا مطلب ہے' ادیبوں کی جان سدا ان کی مٹھی میں رہتی ہے۔ اس لئے ایک ہفتہ کے بعد میں نے بنگلہ دیش چھوڑ دیا اور اپنے لئے جلا وطنی قبول کرلی۔

اب---- مجھے چار برس ہوگئے ہیں' جلا وطنی لئے ہوئے۔ ہندوستان میں پناہ لے رکھی ہے۔ اب جس کو میرا کمرہ کہہ سکوں' ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ کسی بھی دوست کے گھر رہ کر' کسی بھی کونے میں بیٹھ کر لکھ لیتا ہو----

میرا ڈھاکہ والا کمرہ' کمرے میں پڑی ہوئی کتابیں' کھڑکیوں کے باہر اگے ہوئے انار کے پیڑ اور کمرے میں پڑے ہوئے موسیقی کے ریکارڈ اب مجھے میرے ہی کسی پرانے جنم کی تواریخ جان پڑتے ہیں---

امرتا پریتم 1919

میرے ذہن میں "میرا اپنا کمرہ" تھا' بڑی ضد ٹھان کر بیٹھا ہوا' جسے زمین پر اتارنے میں میری عمر کے بیالیس سال لگ گئے----

پہلی بار جب میں نے 6 x 6 فٹ کا ایک کمرہ ہتھیایا تھا' میں کوئی دس برس کی رہی ہوں گی- وہ اصل میں ہمارے مکان کی سیڑھیوں کے بیچوں - بیچ بنی ہوئی ایک بخاری تھی' جو لکڑیاں اور کوئلے رکھنے کے لئے تھی- جس کی دہلیز کے ساتھ لٹک کر اندر جا سکتے تھے- اور اس سے باہر آنے کے لئے بھی لٹک کر کسی سیڑھی پہ پاؤں اٹکانا پڑتا تھا- اور میں نے اسے دھو کر' اس کے فرش پر دری بچھا کر اسے اپنا کہا تھا- لیکن وہ جیسے میرے دل میں کھنچے ہوئے نقشے کے کیل کانٹے تھے-

لاہور میں' دہرہ دون میں' بمبئی میں کوئی نہ کوئی کمرہ سر کی چھت ضرور بنا لیکن "میرا" نہیں- "میرا کمرہ" میں نے پہلی بار 1962ء کے مارچ میں دیکھا تھا- زندگی میں پہلی بار گھر بنتا دیکھا' اور گھر کے ایک کمرے نے مجھے اپنی دیواروں کی بانہوں میں لپیٹ لیا----

بنتے ہوئے گھر کو دیکھ رہی تھی کہ شام ہو گئی---- چیخوف کی "بے نام محبت" کی بات کرتے ہوئے تانیانوف لکھتا ہے---- "گھر ہمیں اس کے مکین کے بارہ میں بہت کچھ بتاتے ہیں- لیکن کئی بار گھر اور گھر کا مکین دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہوتے ہیں-" سو اس شام میں نے جانا کہ وہ کمرہ میرا ہے' اتنا میرا کہ اس رات اس کے پاس سے ہٹ کر کہیں جایا نہیں جا سکتا----

زیر تعمیر گھر میں ابھی بجلی نہیں تھی' تاہم موم بتی تھی- میں نے جلا لی-

چوکھٹ میں کواڑ لگ چکے تھے۔ میں نے بند کر لئے۔ لیکن کھڑکیوں میں شیشے کی روک نہیں تھی۔ اس لئے ان میں سے باہر اگے ہوئے لیموں کے پیڑوں کی پتیاں جھڑ جھڑ کر کمرے میں آتی رہیں--- موم بتی کی کانپتی ہوئی لو میں' برہنہ فرش پر لیٹ کر اس رات ایک نظم لکھی---- "چیتر نے بوہا کھٹ کھٹیا----" (چیت نے دروازہ کھٹکھٹایا)

اس رات میں تھی' میرا کمرہ کمرے کا دروازہ اور اسے کھٹکھٹانے والی میری چیت کی دستک---- لگا' آج اگر دنیا سے جانا پڑے تو سکون قلب کے ساتھ جا سکتی ہوں۔ اپنی دیواروں کی بانہوں میں لپٹی ہوئی' اپنے فرش کی گود میں سر رکھ کر لیٹی ہوئی' اور اپنے اوپر نیم کی پتیوں کا سبز کفن لیکر لیٹی ہوئی--- پاس ہی کاغذ پر لکھی ہوئی نظم میری وصیت کی طرح تھی----

اس کے بعد کے برس مجھے زندگی کی "نئی لیز" کی طرح ملے ہیں۔ اب وہی بارہ فٹ' بارہ فٹ کا کمرہ ہے جس میں ایک جانب شیشے کے سات خانوں والی الماری ہے' جس میں میری کتابوں کا ایک ایک نسخہ---- میرے افکار کے حوالے کی مانند پڑا ہوا ہے۔ اوپر کے خانے میں سب وہ جو میں نے ترجمہ کئے ہیں' دوسرے میں وہ کتب جو میں نے پنجابی میں تصنیف کی ہیں' تیسرے میں وہ جو ہندی میں ترجمہ ہوئی ہیں۔ پانچویں میں سب کتابوں کے پیپر بیک ایڈیشن' اور چھٹے اور ساتویں میں وہ سب جو دنیا کی مختلف زبانوں میں مختلف لوگوں نے مرتب کی ہیں اور جن میں دو دو چار چار صفحات میری نظموں یا کہانیوں کے ہیں---- اس سات خانوں کی الماری میں کرشن کی چندن کی مورتی بھی ہے' موتیوں سے مرصع ناریل بھی ہے' نگوں والی مٹی کی صراحب بھی' اور ساتھ ہی یادوں کے کچھ ٹکڑے بھی جو مجھے اپنے ملک یا باہر کے ملکوں سے خاص موقعوں پر ملے ہیں---

کھڑکی والی سمت میں خانوں والی ایک میز ہے جس میں امروز کے خطوط ہیں' زندگی کے ساٹھ برسوں کی اپنی اور اپنے دوستوں کی تصاویر ہیں' اور ناشروں سے کئے ہوئے اقرارنامے ہیں۔ میز پر ایک آئینہ ہے جس پر مہاتما بدھ کی تصویر

ہے---- ایک تصویر میری اور امروز کی ہے۔ کمرے میں صرف ایک پینٹنگ ہے---- ہارڈ---- بیڈ کے سرہانے کی طرف لگی ہوئی جس میں صرف دو پر پینٹ کئے ہوئے ہیں۔ امروز پینٹنگز میں سے صرف اسے میں نے اپنے کمرے کے لئے منتخب کیا ہے۔

لکھنا' سونا' سوچنا' پڑھنا جس کونے میں ہے' اس کے دونوں جانب دو لیمپ ہیں اور بائیں ہاتھ وہ کتابیں جو مجھے اپنے ہاتھ کے پاس چاہئیں کلچرل' ہیری ٹیج آف انڈیا' عالمی مائیتھولوجی کی پوری جلدیں' ہسٹرف آف ورلڈ پینٹنگ کی سب جلدیں' آئین رینڈ کی تمام کتابیں' کازان زاکس کی کل تصانیف اور دنیا کی کچھ اور عمدہ کتابیں---- اس کونے کو امروز اکثر تازہ پھولوں سے بھر دیتے تھے۔

بائیں دیوار پوری کی پوری کتابوں کے لئے مخصوص ہے' سامنی دیوار بھی' دروازوں کو چھوڑ کر' کتابوں کے لئے ہے۔ اور کھڑکیوں کی طرف کی دیوار بھی' کھڑکیوں کو چھوڑ کتابوں کے لئے ہے۔ دیواروں کے حصے بانٹے ہوئے ہیں---- نظم کے لئے' ناولوں کے لئے' افسانوں کے لئے' سوانح عمریوں کے لئے اور تاریخ و فلسفہ کے لئے---- سو میرے حساب سے گوروگرنتھ صاحب نظم کے حصہ میں رکھے ہوئے ہیں اور مہابھارت فلسفہ والے حصہ میں----

سامنے کی دیوار کے ساتھ لگا کر رکھی ہوئی نو خانوں والی ایک بند الماری ہے جس کا ہر خانہ ایک ایک کام کا حساب کتاب سنبھالے ہوئے ہے' جیسے ایک خانہ' ہر سال کی آمدنی کا' ایک انکم ٹیکس کا' ایک چھپنے والی کتابوں کے مسودوں کا ایک ان کے ہندی تراجم کا' ایک مرتب کی جانے والی تصانیف کا----

کتابوں کے خانوں میں کسی کسی جگہ چھوٹے چھوٹے چوکھٹوں میں جڑی ہوئی تصویریں ہیں---- میرے بچوں کی۔ اور ایک الماری کے بند حصے پر ایک کیل ہے جس پر کبھی مونالزا کی تصویر ٹانگ دیتی ہوں' کبھی خلیل جبران کی اور کبھی اک وہ تصویر جو تمام دنیا میں ضبط ہو چکی ہے۔ یہ ایک اطالوی مصور کی بنائی ہوئی ہے' لیکن اس کا پورا ذکر نہ کروں گی کیونکہ یہ دنیا میں ضبط ہو چکی ہے---

یہ کمرہ وہ نہیں ہے جو میرے ذہن میں تھا اور بیالیس برس میرے ذہن میں پڑا رہا تھا---- زمین نے اس کو ضبط شدہ قرار دے دیا تھا---- اور زمین کا وہ قانون امروز نے پلٹ دیا تھا' 1962 میں!

میں نہیں جانتی---- زمین سے چلے جاکر پھر زمین کے ساتھ کوئی تعلق رہتا ہے یا نہیں۔ اگر رہتا ہو تو میرا اس کمرے کے ساتھ ضرور رہیگا---- اور اسی اعتقاد سے میں نے وصیت کر رکھی ہے کہ میرا بیٹا اور میری بیٹی میرے کمرے کو میرے بعد بھی "میرا" رکھیں گے۔

یہ جو ناممکن سا تھا' اس کو ممکن بنانے میں میری ساری عمر لگ گئی ہے۔ اسی لئے اس کی بات کہتے ہوئے میں نے صرف تسلی لفظ کو سامنے رکھا ہے۔ لیکن جو اس لفظ سے آگے ہے' وہ ابھی بھی میرے ذہن میں ایک امانت کی طرح پڑا ہے---- اور لگتا ہے' وہ اس زندگی کی نہیں' کسی اگلی زندگی کی امانت ہے۔ وہ کسی پہاڑ کی غار ہے یا ایک جزیرے کا وجود' اور وہ دونوں صورتوں میں ایک سی شدت کے ساتھ میرے ذہن میں ابھرتے ہیں---- کوئی بھی شہر میرے کمرے کے پس منظر کی صورت میں میرے فکر کا حصہ نہیں ہے' لیکن شہر کے نقشہ سے کمرے کو کتر کر میں نہیں رکھ سکتی۔ اس لئے اس کی ہر کھڑکی کے آگے کسی نہ کسی بیل کی اوٹ دے کر اسے کسی حد تک شہر سے بچاتی ہوں۔ لیکن ذہن کے حقیقی نقشہ کے مطابق کمرے کے اردگرد صرف جنگل ہے۔ صرف جنگل----

یہ جو ممکن ہوا ہے' غنیمت ہے۔ لیکن اس کی سبز بیلوں میں ایک حسرت کے رنگ کی بیل بھی اگی ہوئی ہے' کہ اس کمرے کو ذہن سے زمین پر لینڈ کرتے وقت کسی شہر میں نہیں' کسی جنگل میں اترنا چاہئے تھا----

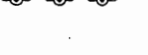

پیار اسنگھ رمتا 1923

ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک جانے کے لئے راستہ کی دھول میرے ٹخنوں، گھٹنوں کے بیچ سے گزری ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کتنے شہروں نے میرے آنے کا استقبال کیا ہے اور کتنوں نے الوداع کہی۔ صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ راتیں کہیں اور دن کہیں گزارے ہیں۔ بھٹکتے ہوئے سانسوں کو زبردستی کسی کمرے کی جگہ دے بھی دوں تب بھی خانہ بدوش کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں ریت ہی چبھے گی۔ بھوکے پیاسے دن یاد آئیں گے اور ایک چھوٹی سی عمر زندگی کے ہاتھوں میں گھٹ کر مرجائے گی۔

پھر بھی پہلی عمر نہیں بھولتی۔ اس کا ساتھ نہیں بھولتا۔ وہ کمرہ نہیں بھولتا جس کے تصور میں میں تمناؤں کے دیئے جلا کر اس لڑکی کا انتظار کرتا رہتا تھا جس کا گھر بیتر نی ندی کے پار تھا اور وہ چاندنی کی طرح میرے کالے آسمانوں پر چڑھ کر لوٹ جاتی تھی۔ اور اپنا پتہ ٹھکانہ نہیں بتلاتی تھی۔ عمر کی بست پیاری منزل میں ہی میں اس لڑکی کی تلاش میں بھٹک گیا اور سوچتا رہا، چاندی ہی سب کچھ ہے۔ اسے آنکھوں میں ڈال لوں، مٹھیوں میں بھرلوں اور تنہا رات میں بیٹھ کر اس کے حسن کو دیکھتا رہوں۔ لیکن میرا یہ لڑکھڑاتا تصور آنسو تو بن گیا ہے، کمرے کا سچ نہیں بنا۔

اب میں کہیں بھی رہوں، میرے سکھ کو اس کمرے کا دکھ نہیں بھولتا۔ ماں کی ممتا اور بہن بھائیوں کا دلار نہیں بھولتا، باپ کی جدائی نہیں بھولتی۔ لوگ کہتے تھے کہ کمرہ شیر مکھا ہے۔ اس میں برکت نہیں رہتی، آگ کو آگ راکھ کرتی رہے گی اور پانی کو پانی سوکھتا رہے گا۔ لیکن ماں کو کمرے سے گہرا انس تھا۔ وہ اپنے

ناتواں ہاتھوں کی گری گری ہمت سے آٹھویں۔ دسویں روز ضرور دیواروں پر سپید مٹی پوت دیتیں اور پھونکیں مار مار کر چولہے میں آگ جلاتی تھیں۔ شام تک ہمارا کمرہ سوکھ کر کٹھے کی سپید چادر ایسا ہو جاتا تھا۔

کمرے میں الماری کے نچلے خانے میں میری سکول کی کتابیں، پنج گرنتھی، بائیس گاتھائیں، بھگتوں کی بانی اور بھائی گورداس جی کی تصانیف رومال میں لپیٹ کر رکھی ہوتی تھیں۔ اور اوپر والے خانے میں ماں کی پاٹھ کرنے والی کتاب بھگوت گیتا رکھی ہوتی تھی، پتھر کے چھاپے کی پرانی لکھائی بمعہ تصاویر۔ ماں روز گھر کے کام سے نمٹ کر چوکی کے اوپر رکھ کر اس کو پڑھا کرتی، اور میں کرشن بھگوان کا تصور کرتا جو رکمنی کو اپنے رتھ پر بٹھا کر کسی ڈنڈی، پگڈنڈی کے بغیر ہی دوڑا رہے ہوتے رتھ کو۔ پیچھے ششوپال کا رتھ فوج سمیت ان کو روکنے کے لئے جاتا ہوا دکھائی دیتا۔ میں سامنے بیٹھ کر تصویریں دیکھتا رہتا۔ اڑتی ہوئی گرد میں دونوں رتھ لپٹے ہوئے ہوتے۔ اور بے تحاشا دوڑتے ہوئے گھوڑوں کو دیکھ کر میں ماں سے پوچھتا۔۔۔۔ "یہ رتھ کہاں دوڑے جا رہے ہیں ماں؟ یہ لشکر کس کا تعاقب کرتا ہے؟۔۔۔۔ یہ ایک دوسرے کو تیروں کا نشانہ کس لئے بناتے ہیں۔۔۔؟

ماں کہتیں، یہ "کرشن بھگوان کی لیلا ہے۔ یہ جو رکمنی ہے۔۔۔۔ "ماں اس کی خوبصورت شبیہہ پر انگلی رکھ کر بتاتیں۔ "اس کا ششوپال سے دو ایک گھڑی میں بیاہ ہو جانا تھا۔ لیکن کرشن بھگوان پھیرے ہونے سے پہلے ہی رکمنی کو شاہی محل کے مندر سے اٹھا کر لے آئے۔ یہ رتھ جو دوڑے جا رہے ہیں۔۔۔۔ لیکن تم اگلے ادھیائے کو غور سے سنو۔۔۔۔ "ماں پھر اپنا پاٹھ شروع کر دیتیں۔ اس زمانہ میں اس کمرے کے اندر ماں سے سنی ہوئی چھوٹی چھوٹی باتیں اب میرے ذہن و دل کا مخزن علم ہے۔ کاش! وہ سب کچھ بدل نہ پاتا اور میں ہمیشہ اک ننھا بچہ رہ کر ماں سے کرم گیا سنتا رہتا۔

لیکن یہ تو ایک چھوٹی سی عمر کے رات و دن کا سپنا تھا اور وہ بیت گیا۔ وہ کمرہ اب میرے لئے گھر کی سب سے اونچی منزل سے بھی اونچا ہو گیا ہے اور اس کی

بنیادوں میں گھومتا ہوا میں اپنی' سمت ڈھونڈ رہا ہوں۔ شاید اس کمرے سے باہر آنے کا راستہ بھول گیا ہوں اور بار بار دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی سوئیوں کو دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ کمرے کی چھت پر ایریل پر ٹنگا ہوا سر سہمے ہوئے پرندے کی طرح بول رہا ہے۔ لوگ کہتے ہیں' پرندہ بہت سیانا ہے' اسے ضرور کچھ نظر آرہا ہے' مگر یہ بتا نہیں سکتا۔۔۔۔ میں بتا سکتا ہوں مگر پرندے کی طرح بول نہیں سکتا۔ اس لئے مجھ میں اور ایریل میں تناؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ اور اب اس کا اشتراک بھی راس نہیں آتا۔ مخالفت بھی نہیں۔ میرے کمرے نے مجھے اپنے دامن میں تو لے لیا ہے لیکن کبھی آنسو نہیں پونچھے' نہ ہی میرے کردار کو میری بغل سے اٹھا کر کسی بلند و پست مقام پر نشر ہونے دیا ہے۔ مجھے کمرے میں بیٹھ کر وہ باتیں سوجھتیں ہیں جو عامیانہ نہیں ہوتیں۔

کمرے میں بیٹھے ہوئے میں سیج سے اتر کر قتل گاہ کی طرف چل پڑتا ہوں۔ میرے سر پر زمین ہے اور پاؤں کے نیچے آسمان ہے۔ میں سمبھلے سمبھلے بھی خلاء میں گر رہا ہوں۔ اور گرتے ہوئے آنکھوں کے آگے سمندر' ریت' پہاڑ اور کنوئیں دکھائی دیتے ہیں اور کبھی کبھار ہرے ہرے کھیت جن پر بم بھی گرتے ہیں اور بارش بھی ہوتی ہے۔ میں سوچتا ہوں' میرے کمرے میں زمین و آسمان آگئے ہیں۔ میں اب اس کا خدا ہوں۔

مگر میں پھر اپنے ہی پاؤں کی آہٹ سے جاگ پڑتا ہوں اور آنکھوں کی خموشی میں بولتے ہوئے منظر اپنی اپنی جگہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ میں تنہا اپنی نظر کی دھندلی لپیٹ میں آکر باہر کسی کے تپتے ہوئے پاؤں کو دیکھتا ہوں جن پر بیٹھ کر میں ٹھنڈی سانس لے سکوں۔

اگر میں کہہ دوں کہ آخر میرا کمرہ میرا کیا لگتا ہے جس کی محبت میں میں بنا پروں کے اڑتا جاتا ہوں' تب بھی سچ ہے۔ اس کمرے میں کتنی نیکیاں ہوئی ہیں' کتنی بدیاں۔ کئی بار اچھے لوگ اجڑے ہیں' کئی بار برے مگر میرے ذوق کی محفل کبھی نہیں جمی پھر بھی اچھے چھوڑتا کم ہوں' استعمال زیادہ کرتا ہوں۔ کیا معلوم' کس

وقت کا سہرا میرے کمرے کے سر پر ہو اور میں اس میں بیٹھا بابا پھکڑ شاہ کے مزار کی طرح مقبول ہو جاؤں۔ اس لئے کمرے میں ہولے ہولے کتابیں بھی رکھ دی ہیں اور اپنے افکار کا انبار بھی۔۔۔۔

ایسے حالات میں ہی ایک مہینے بعد میرے پاس ناگ منی آتی ہے تو ادب کی چاہت میں دنیا بھر کے دوستوں سے میرا خالی کمرہ بھر جاتا ہے۔ کئی احباب میرے کمرے کی دیواروں کی طرح اداس ہوتے ہیں اور کئی کمرے میں ٹنگی تصویروں کی طرح مسکراتے ہیں۔ مگر اپنی اپنی لکیر پر چلتے آتے کو ہستان کی طرح ناقابل تسخیر ہوتے ہیں۔ میں ایک ایک کرکے ان کو پڑھتا ہوں۔ خیال کا سچ ہر صفحہ پر ملتا ہے۔ شاید یہ ناگ منی کے متبرک بول میرے دل کا زہر پی لیتے ہیں۔۔۔۔ اور یہ لمحات میرے لئے پرسکون بھی ہوتے ہیں اور تعمیری بھی!

رات ابھی باقی ہے اور میں کہتا ہوں' دن نکل آیا۔۔۔۔ سورج کی سرخ کرنوں کے بغیر ہی کوئی اجالا میرے کمرے کی تاریخ ہے۔

کمرہ مدت سے ہوا میں معلق ہے اور میں اس کے تصور میں بارہ برس غار میں رہ کر روشنی کے لئے ترستا رہا۔ بارہ سال ناکامیوں کے کنویں میں رہ کر پانی بلوتا رہا۔ بارہ سال وطن سے دور غیر ملک میں مزدوری کے لئے بھٹکتا رہا۔ اور اب قلم کی کرامات سے اس کمرے میں حروف کی مانند الٹا لٹک گیا ہوں۔

ایک شہر سے دوسرے شہر کو الوداع کہہ کر جب میں چلا تھا تو وقت لوہے کے جال کی طرح میرے پاؤں میں بچھا ہوا تھا۔ اس کو چھینی اور ہتھوڑے سے توڑتے ہوئے اب تک سڑک سے اتر کر کمرے کی طرف آرہا ہوں۔ راستوں پر روشنیاں ابل رہی ہیں اور پہچان کے لئے سیلن بھرے گاؤں کی پختہ گلی کے نو دروازے ادھر' نو ادھر' اور بیچ والا دسواں' دروازہ میرا ہے۔ چار دیواروں کا ایک خصوصی کردار۔۔۔۔ میں اس میں بیٹھ کر اونچا اٹھنے کے لئے بہت وسیلے سوچتا ہوں' اپنا قصور آپ قبول کرتا ہوں۔ ریڈیو کی دھیمی آواز سنتا ہوں اور اپنی آواز کو دیواروں کے مساموں سے پار جاتے ہوئے آپ پہچانتا ہوں۔ اس لئے کمرے میں بیٹھے ہوئے

میں کئی بار کھو جاتا ہوں۔ میرے سر کے گرد کانٹے دار تار کی باڑ بار مجھے چھیلتی ہے اور میں سوچتا ہوں، یہ سچ ہے، سچ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اور مٹی ہے، سچ ایسی۔ زمین کے دوسرے سرے پر بھی یہی کچھ ہے اور سمندر کے دوسرے کنارے پر بھی یہی کچھ میں کھوئے ہوئے بول ہر مٹی میں سے ڈھونڈتا ہوں---

اس طرح کے سچ کے ساتھ میں اک خالی کمرہ ہتھیا کر بیٹھ گیا ہوں۔ اگرچہ یہ میز کرسی اور ایک پلنگ سے بھرا ہوا ہے مگر اس کمرے کا ہر کونا خالی ہے۔

اگر اس کی دیواریں ضروری ہیں تو دیواروں پر چپکی ہوئی تصویریں خودداری کے بغیر، خالی ہونے کے باعث بے کار ہیں۔ اور بیکار و بے معنی شے میں سے کوئی معنی ڈھونڈنا میری اپنی تلاش ہے---- اس لئے میں پورے اطمینان سے بیٹھ گیا ہوں تو میرے لئے میرے اندر سوئی ہوئی تھکن جاگ اٹھی ہے اور میں لفظوں کے ریگستان میں گھومتے ہوئے آنکھوں کے سامنے نیلے، سپید کورے کاغذ کھڑکھڑاتے دیکھتا ہوں۔

اس وقت میرا کمرہ میرے لئے سب کچھ ہے، شراب بھی، عبادت بھی یکسوئی، گھر کا شور، دھوپ، چھاؤں، برقی پنکھا اور برسات کا حبس، سب مجھے راس ہیں۔ اس کمرے میں رہتے ہوئے اب مجھے چھ ماہ بیت گئے ہیں اور پردیس کے بیس سالوں کی تلخی کا جو خمار ہے، ہولے ہولے میرے سر کو چڑھتا جا رہا ہے اور میں ایک آہنگ سا ہوتا جا رہا ہوں۔ پرندوں سے بھی اوپر کی آواز جو کبھی تھکتی نہیں، اڑتی نہیں گرتی نہیں۔

کمرے سے پہلے یہ بہت پرانی اور اداس جگہ تھی، اس پاس کچی دیواروں کے اپنے نوحے تھے اور جگہ کی ویرانی کا اپنا نالہ و شیون۔ کوئی بھولے سے بھی آگ نہ جلاتا تھا۔ مگر اس کی ویرانی میں سے کچی گندھک ایسی باس آتی تھی۔ یہ جگہ گاؤں کے مسلمانوں کی خریدی ہوئی اپنی جگہ تھی اور گاؤں کے سکھوں نے اپنا حق دعوے کر کے چھین لی تھی۔ مسلمان اس جگہ مسجد دیکھنا چاہتے تھے۔ سکھ مسجد نہیں چاہتے تھے۔ سال بھر جھگڑا چلتا رہا۔ اور آخر فیصلے میں ایک فریق کی ہار ہوئی اور

ایک کی جیت ہوئی۔ بھیڑیوں کے جبڑوں سے چیری چبائی بکری کی ادھ مری لاش میں نے خرید لی اور اس پر مقدس پانی کے چھینٹے دے کر آگ جلا دی۔ ہری ہری کونپلوں والے بیل بوٹے بیج دیئے اور اک چھوٹا سا گھر بنا لیا۔ تمنا نے ہمارے پاؤں کے نیچے ہتھیلیاں رکھ دیں۔ اس کی گرم سرد ہواؤں میں ہم رنگ کی طرح اڑاتے پھرے۔۔۔۔ اور اب وقت کا تقاضا ہے کہ جس کمرے میں خدا کو ہونا چاہئے تھا' وہاں اب میں ہوں' میری بیوی ہے اور بڑی ساری دنیا کا ایک چھوٹا سا کنبہ ہے میرا۔ ہم دل سے بولتے ہیں' دل سے سنتے ہیں اور ساری مٹی کی محبت کو گلے لگا کر جی رہے ہیں۔

یہ بات میں اب تو نہیں کہتا' مگر پہلے کہا کرتا تھا کہ یہ کمرہ کرشن بھگوان نے مجھے سدا ماجان کر آنکھ جھپکتے بنا دیا ہے۔ بھگوان نے سوچا ہوگا' وہ بھی کیسا بھگت ہوا جو ساری عمر کرائے کے بیگانے غار نما کمروں میں بستا رہے اور باہر سڑکوں پر نکل کر بڑی بڑی عمارتوں سے خوفزدہ ہوا رہے۔ اس لئے اس دس مرلہ زمین پر بنا بنایا گھر اپنی وراثت میں سے کاٹ کر گاؤں حسین پور' لالو وال ڈاک خانہ خاص اور ضلع ہوشیار پور میں لا رکھا۔

اس امید و ناامیدی کے دور میں' میں یہ نہیں جان سکا تھا کہ کب میرے گھر کی دیواریں بنیں اور کب چھت پڑ گئی۔ میرے پاس تو ایک خط آیا تھا' اس میں کورے کاغذ کی زمین پر دروازوں اور کھڑکیوں سمیت پنسل سے لکیریں کھینچ کر لکھا ہوا تھا۔ یہ کمرہ گھر کے استعمال کے لئے' یہ کمرہ آئے گئے مہمانوں کے بیٹھنے اٹھنے کے لئے۔۔۔ اس دن میں نے دونوں کمرے جیب میں ڈال لئے' سینے سے لگائے اور گاؤں میں ایک پختہ مکان کا مالک بن کر' دور ملک عرب میں بیٹھا ہوا حسین خوابوں میں سوتا رہا' اس کمرے میں' جس کا ایک ہزار روپیہ مہینہ کرایہ میں دے رہا تھا۔ اس کمرے میں تین اور مکین تھے' چوتھا میں تھا۔ دن میں کام کرتے' رات کو کمرے میں غل مچاتے' ریڈیو سنتے یا سینما دیکھتے۔ پھر بھی میں ان کے بیچ اداس ہو جاتا اور اکیلے رہنا چاہتا۔ راتوں کو تارے دیکھتا اور سویر کو ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کا

انتظار کرتا۔ کمرے کے ایک کونے میں اپنے تخت کے سے پلنگ پر بیٹھ کے نظم کے لئے ردیف و قافئے جمع کرتا رہتا یا پارک والی پچھلی سڑک پر برقی کھمبے کے نیچے جا کر اپنے تخیل کو سہارا دیتا اور گئی رات تک جملوں و بولوں کی فراق میں جاگتا رہتا۔ سویرے سو کر اٹھتا تو پھر شب کی مانند لکھنے کو جی چاہتا۔ لیکن کام کی مجبور دھن میں افسانوں اور نظموں کی طرح روٹیاں گن گن کر ٹفن کیریئر میں ڈال لیتا۔ اس وقت' خدا جانتا ہے' کیسے میری نگاہیں مشرق و مغرب میں گھومتیں' کیسے میرا لہو پگھلتا اور کیسے کام کرتے ہوئے سامنے والی کرسی کو گھورتا رہتا۔

"میں یہ کمرہ چھوڑ دوں گا!" میں اپنے ہم نشینوں سے کہتا۔

"کہاں جاؤ گے؟" وہ پوچھتے۔

"کہیں بھی----" گورونانک کی طرح دری بچھانے کے لئے جنگل بیابان میں جھاڑو سے کنکر کانٹے ہٹایا کروں گا یہ زمین کیڑوں مکوڑوں نے دبا لی ہے اور جنگل کے اندھیرے میں سر پر آسمان بھی نظر نہیں رہا ہے۔ یہاں ویسی جگہ نہیں ملی جہاں ایک کمرے سے اداس ہو کر ٹیگور کی طرح دوسرے کمرے میں جا بیٹھوں اور لکھ لکھ کر ہدیہ عقیدت پیش کروں۔ دنیا اتنی بدل گئی ہے کہ محبوب کی گلی کے کمرے جیسا کچھ بھی نہیں رہا۔ کمرہ ہے پر دروازہ نہیں ہے' اور میں باہر آنے کا راستہ بھول گیا ہوں۔ پہچان کے لئے پختہ گلی کے نو دروازے ادھر' نو ادھر' اور بیچ والا دسواں دروازہ میرا ہے----!"

ونجارا بیدی 1924

لوگ قصہ سناتے ہیں کہ ایک راجہ اپنے کسی فنکار دوست کے ساتھ گھومتا ہوا ایک دریا کے کنارے پر جا پہنچا- وہاں ایک پری نہا رہی تھی- ان دونوں نے اس پری کے کپڑے اٹھالئے اور ایک پیڑ کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گئے- جب پری نہا کر نکلی تو اس نے راجہ سے اپنے کپڑے مانگے- لیکن راجہ نے اس کو اس وقت تک کپڑے لوٹانے سے انکار کر دیا جب تک پری ان دونوں کو بدلہ میں کوئی کراماتی شے عطا نہیں کرتی- پری نے اسی وقت دریا میں ڈبکی ماری اور دو کڑاہیاں نکال لائی---- ایک سونے کی اور دوسری پیتل کی- راجہ نے سونے کی کڑاہی خود لے لی اور پیتل کی فن کار کے حوالہ کر دی-

جب راجہ نے پری سے اپنی کڑاہی کی خوبی دریافت کی تو اس نے کہا---- سونے کی کڑاہی چھتیس قسم کے کھانے' بناؤ سنگھار کی چیزیں اور زری و کمخواب پیدا کرتی ہے- کھانے پہننے کے لئے اس سے جو مانگو گے' فی الفور حاضر کر دے گی-

"اور یہ پیتل کی کڑاہی؟" فن کار نے پوچھا-

"تم جس چیز کا تصور کرو گے' وہ اس کڑاہی میں ہو بہو ظاہر ہو جائیگی---- یہ تمہارے تخیل کو مجسم بنائیگی!"

فن کار نے اس کڑاہی کی کرامت آزمانے کے لئے ایک حسین دوشیزہ کا تصور کیا اور اس کے تصور کے عین مطابق پیتل کی کڑاہی میں ایک حسینہ کی شبیہہ ابھر آئی-

یہ دیکھ کر راجہ نے پیتل کی کڑاہی کلاکار سے چھین لی اور کہا---- "یہ

کڑاہی مجھے دیدو۔ تم سونے کی لے لو۔"

اس پر پری نے ہنس کر کہا۔۔۔۔ مہاراج! یہ کڑاہی آپ کے کس کام کی؟"

"کیوں نہیں؟ مجھے بھی سندر سلونی دوشیزاؤں کی فنی تصویریں بھاتی ہیں۔ میں اس کڑاہی کے ذریعے اپنی پسند کی دوشیزائیں پیدا کر کے محل کو سجاؤں گا۔"

"نہیں مہاراج! آپ بھوگنا جانتے ہیں' پیدا کرنا نہیں جانتے۔" پری اسی رو میں کہتی گئی۔" آپ کے تخیل کو حسن کا تصور نہیں ہے۔ آپ کسی گیت کو زندگی نہیں دے سکتے' نہ ہی حسن کو جسم۔ نہ ہی آپ کسی جذبہ کو شباہت دینا جانتے ہیں۔ فن کی تخلیق آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔"

راجہ نے اپنی قوت متخیلہ کو آزمانا چاہا۔ اس نے ایک خوبصورت لڑکی کی شبیہہ اپنے دل میں بنائی جس کی ناک تلوار ایسی تیکھی' آنکھیں ہرن جیسی' گال سیب کے سے گول اور سرخ' صراحی دار گردن اور چمپا کی کلیوں جیسے دانت تھے۔ جو کتابی نقوش اس نے پڑھے سنے تھے' ان کا تصور باندھ لیا۔

پیتل کی کڑاہی میں سے ایک بے ڈول سی لڑکی کی شبیہہ ابھر آئی۔

"بس دیکھ لیا مہاراج! پری نے کہا۔ "آپ کے پاس حسن کا کوئی تصور ہی نہیں ہے' تخلیق کس کی کریںگے؟"

راجہ شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ اس نے پیتل کی کڑاہی فن کار کو دے دی۔

فن کار کی قوت متخیلہ ثمردار پیڑ ہے جس پر کئی طرح کے پھل لگتے' رستے اور ٹوٹتے ہیں۔ وہ حسن کو تہذیب اور تاریخ کا حصہ بناتی ہے۔ سچ مچ اس کا کمرہ وہ پیتل کی کڑاہ ہوتا ہے جس میں بیٹھ کر فن کار طویل ریاضت کے ذریعے اپنے تصور کو زندگی دیتا ہے۔ اگر فنکار کے پاس تصور کا درخت اور احساس نہیں ہے تو پیتل کی کڑاہی کوئی کرامت نہ کر سکے گی۔

فن کار کا اپنے کمرے سے صرف خارجی رشتہ نہیں ہوتا۔ اس میں اس کی اپنی ہستی سمائی ہوتی ہے' جزوی طور سے! اگر فنکار اس کا شعوری حصہ ہے تو کمرہ لاشعوری۔ جس طرح خدا ساری کائنات میں سمایا ہوا ہے' اسی طرح فنکار اپنی

تخلیق میں سمایا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ پیتل کی کڑاہی میں سے بار بار اپنی ہی تخلیق کرتا ہے' الگ الگ صورتوں اور جسامتوں میں!

یہ ضروری نہیں کہ فنکار کا تخلیقی مقام کوئی کمرہ ہی ہو۔ یہ گھر کا صحن بھی ہو سکتا ہے' جھیل کا کنارہ بھی' اور گلی کا روشنی کا کھمبا بھی۔ جب میں نے پہلی بار لکھنے کا ارادہ کیا تو میرا تخلیق کا کمرہ میرے گھر کی چھت تھی جہاں بیٹھا ہوا میں بادلوں کی سنہری ٹکڑیوں کو بکھرتے' جڑتے اور کئی کئی جسامتوں میں بدلتے دیکھتا تھا۔ جب میں نے سورج کو ان میں بہت سی صورتوں میں رنگ بھرتے ہوئے دیکھا تو میرے اندر بھی شعر کا تخلیقی عمل شروع ہوگیا۔ یوں قدرت میری محرک ہوئی۔ مجھے گھر کی چھت پر پہنچ کر یوں محسوس ہوتا جیسے میں ساری کائنات کے ساتھ منسلک ہو گیا ہوں۔ جیسے میرا وجود پگھل کر بادلوں' پرندوں اور کرنوں کی صورت میں کائنات کا حصہ بن گیا ہو اور وہاں تصور کے ذریعہ رس نچوڑ کر اک اک بوند اکٹھی کر کے تخلیق کر رہا ہو۔

کمرے میں آکر میری پرواز خیال محدود ہو جاتی' سکڑ جاتی اور میں بے پر کے پرندے کی طرح گر پڑتا۔ مجھے تب ہی جان پڑا کہ قدرت اور فن ماں بیٹا ہیں۔ قدرت ہی فن کو پیدائش دیتی ہے۔ میں اور میرا تخیل تو محض ذریعہ ہیں۔ میں نے تب بارہا اپنے آپ کو آسمان میں پھیلتے ہوئے محسوس کیا تھا۔

ملک آزاد ہوا تو راولپنڈی کو سدا کے لئے الوداع کہنے کے باعث مجھ سے گھر کی وہ چھت جو میری "پیتل کی کڑاہی" تھی' چھن گئی۔ لیکن میں چھوٹی دنیا سے نکل کر نئی وسعتوں میں پھیلنے لگا۔ لیکن میرا ایک تو قدرت سے تعلق ٹوٹ گیا' دوسرا میرے پاس کوئی پیتل کی کڑاہی نہ رہی۔ جہاں میں ٹک کر ریاضت اور تخلیق کر سکتا۔

لیکن ان دنوں جس جگہ بیٹھ کر میں لکھتا تھا' وہ ایک تنگ سی گلی میں دم گھونٹ کمرہ تھا جو گلی کی جانب کھلتا تھا۔ گو اس کمرے میں میرا تخیل گھٹا سکڑا رہتا' لیکن میرے دروازے کے آگے سے لوگوں کی بھیڑ ایک رواں دواں لہر کی طرح سدا

چلتی رہتی جیسے آس پاس کوئی میلہ لگا ہو۔ وہاں مجھے ایسا لگا جیسے میں باہر سے اندر کی طرف سمٹتا جا رہا ہوں' مجھے لگا جیسے ایک وسیع مکانات میرے اندر بھی ہے اور اس کو اپنے جسم میں سے تلاش کر لینے کی طاقت و صلاحیت اگر تخیل کو حاصل ہو تو آدمی روح کے اندر جھانک سکنے پر قادر ہو جاتا ہے۔ وہیں میں نے زندگی کے کئی لمبے کام شروع کئے۔ اسی تنگ گی کے بیرونی کمرے میں میں نے "لوک دھارا" کا نام منتخب کیا۔ وہ مکان دہلی کے رام لیلا میدان کی ملحقہ گلی میں بازار سیتا رام میں تھا۔ رام لیلا اور دسہرے کے دنوں میں لوگوں کی بھیڑ صبح سے شام تک گزرتی رہتی تھی۔ یہی حال ہولی کے دنوں میں ہوتا تھا۔ لوگ موج در موج بن کر ناچتے' اچھلتے' گاتے اور باجوں پر دھنیں بجاتے وہاں سے گزرتے۔ مجھے وہ لوگ اور انکا کلچر اور مذہب سب لوگ دھارا لگا اور وہیں مجھے یہ نام سوجھا۔ لوک دھارا کا بیشتر مواد بھی میں نے وہیں رہ کر اکٹھا کیا۔۔۔۔ کچھ گلی سے گزرنے والے ہجوم سے' کچھ پاکستانی پنجاب سے آئے ہوئے مہاجروں سے اور کچھ پنجاب کے گانوؤں میں گھوم پھر کر۔ ان دنوں میں جو ایک ایک بوند کرکے پھولوں کا رس اکٹھا کرتا تھا' وہ آج شہد کی مکھیوں کا ایک فراخ چھتہ بن گیا ہے۔

بارہ برس بعد جیسے روڑی کے دن پھرتے ہیں' ویسے ہی میرے دنوں نے بھی پلٹا کھایا۔ میں سیتا رام بازار کی تنگ گلی سے نکل کر راجوری گارڈن کے کھلے' قدرتی ماحول میں آبسا۔ (ان دنوں آس پاس کھیت ہی کھیت تھے آج نہیں ہیں) یہاں میں سورج کو طلوع ہوتے' نصف النہار پر پہنچتے اور پھر غروب ہوتے دیکھتا ہوں۔ چاند کو' بادلوں کو پھیلتے' سکڑتے دیکھتا ہوں۔ گزشتہ بیس برسوں میں اس نئے گھر کے ایک کمرے میں میرے شعور نے بہت کچھ تخلیق کیا ہے۔

اس کمرے میں اور کوئی کشش والی شے نہیں ہے سوائے کتابوں کے جو دو ایک برس پہلے تک دیواروں میں بنے ہوئے شیلفوں میں ایک دوسری کے اوپر گری یا لیٹی پڑی تھیں جیسے ابھی لڑ جھگڑ کر ہٹی ہوں۔ اور دو معمولی سی چارپائیاں جن کی جگہ پچھلے برس خوبصورت پلنگوں نے لے لی ہے۔ اور ہاں' شیلفوں کی جگہ بھی اب

خوبصورت الماریاں ہیں۔ اس کمرے میں کوئی کرسی میز بھی نہیں ہے۔ ہاں کچھ عرصہ اک چھوٹی سی میز رہی ہے جس پر چٹھیاں' اخبار اور کتابوں کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔

کرسی یا میز کے بجائے چارپائی یا پلنگ کا ہونا مجھے زیادہ اچھا لگتا ہے۔ کرسی میز پر بیٹھ کر لکھتے وقت مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی دفتر میں بیٹھا فائلوں پر نوٹ چڑھا رہا ہوں یا پھر کسی اخبار کے دفتر میں مجبوراً" ایک ایڈیٹوریل اگل رہا ہوں یا پھر مضامین کے مسودے پریس میں بھیجنے کے لئے ایڈٹ کر رہا ہوں۔ اس طرح کی جذباتی حالت میں تخلیق نہیں ہوتی۔

صوفہ پر بیٹھ کر مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں اپنے گھر میں خود مہمان بن کے بیٹھا ہوا ہوں۔ یا کسی مہمان کے ساتھ بیٹھا محو گفتگو ہوں' مصروف تحریر نہیں۔

میں نے زیادہ تر تصانیف چارپائی اور پلنگ پر بیٹھ کر کی ہیں۔ چارپائی جس پر انسان اپنی زندگی کا بڑا حصہ بتاتا ہے' جہاں وہ خوبصورت خواب دیکھتا ہے' جہاں وہ اپنی محبوبہ کے حسن و شباب کا مزہ لیتا ہے اور ایک سے ایک ہونے کے لئے طبعی عمل کے ذریعہ اپنی نسل کو آگے بڑھاتا ہے' اسی چارپائی پر بیٹھ کر ادب کی تخلیق میرے لئے اک عام سا معمول بن جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ تخلیق ادب کے وقت شعور کو لاشعور میں غرق ہو جانا ہوتا ہے۔ ادب کی تخلیق کے دوران لاشعور' شعور کے ساتھ ہی مصروف عمل ہوتا ہے۔ چارپائی پر بیٹھے لیٹے ہم طبعی طور سے لاشعور کی رو میں جا ملتے ہیں' اپنی حقیقت کو بھول کر نئی خواب آگیں دنیا میں جا بستے ہیں۔

اس لئے چارپائی پر بیٹھ کر میں ساری کائنات سے جڑ جاتا ہوں۔ اس کائنات سے جس میں ہر پل تخلیقی عمل ہوتا رہتا ہے۔ جس کا کوئی بھی پل تخلیق سے خالی نہیں گزرتا۔ سو میری کایا میرے خواب' میرا تخیل ذرہ ذرہ بن کر پھیلتے ہیں اور پھر جڑ کر کئی شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ یہی جدائی اور وصل میری ہر تحریر کی تخلیق کرتے ہیں۔

اس کے برخلاف جب میں کرسی پر بیٹھتا ہوں تو میں سمٹ جاتا ہوں' ایک نقطہ سا بن کر جو پھیل نہیں سکتا۔ اور جو باہر کی طرف پھیلتا نہیں' وہ تخلیق کیا کریگا؟ تخلیق تو باہر کی طرف پھیلنے کے رجحان کو ہی مصور کرتی ہے۔ تخلیق کا ہر ایک عمل جنسی عمل کے تطابق ہے۔ یہ جذبہ صرف حسن اور تلذذ ہی نہیں چاہتا' ساری کائنات کو بانہوں میں سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ سو میں نے زیادہ تر تصانیف چارپائی پر بیٹھ کر کی ہیں۔ ہاں' تصحیح کا کام چاہے کرسی یا صوفے پر بیٹھ کر کیا ہو۔

اس کمرے میں میری برسوں کی پونجی ہے' وہ کتابیں جو میری تحریک و ترغیب کا سرچشمہ ہیں۔ وہ کتابیں جو میرے تخیل کا ثمر ہیں' وہ کتابیں جو میرے خیال میں پڑی اپنے تخلیقی وجود کے انتظار میں ہیں۔ میرا یہ کمرہ کچی دھات کی کان ہے جسے میں کھودے جا رہا ہوں۔

ان کتابوں میں دنیا کی کئی مشہور لغات ہیں' انسائیکلو پیڈیا ہیں لیکن سب سے قیمتی ایک تو "سٹینڈرڈ فوک لور ڈکشنری" ہے جو میری الہامی کتاب ہے' جسے میں نے کئی بار سب کی نظروں سے چھپا کر دھوپ و اگربتی دکھائی ہے' پھول چڑھائے ہیں' سجدے کئے ہیں۔ دوسری گورو گرنتھ صاحب کی سنچیاں ہیں جو میرا دھرم ایمان ہیں۔ یہ میرا بڑا خدا ہے جس سے میں نے بہت بار اپنے چھوٹے خدا کے لئے برمانگے ہیں۔ میرے شیلفوں میں زیادہ کتب وہ ہیں جن کی پیشانی پر لوک یا "فوک" لفظ کسی نہ کسی شکل میں اپنے نورانی وجود کو لئے بیٹھے ہیں۔ لوگ میری طاقت ہیں' میرے معبد ہیں' میرے خدا ہیں۔ لوگ جو کچھ روایتی ڈھنگ تخلیق کرتے آئے ہیں' ورثے میں دے لے رہے ہیں' اسے میں اسی کمرے میں بیٹھ کر اپنے نام کے ساتھ جوڑتا رہا ہوں۔ لوک رو مجھ میں سے گزر کر یہاں نیا وجود لے رہی ہے۔ اس لئے میں نے اس کمرے میں آنے والے ہر لوک کو عزت و احترام دیا ہے۔

اسی کمرے میں میری کائیا نے ساری کائنات سے' میری روح کے نور نے خدائی نور سے' میری میں نے لوک سے باتیں کی ہیں۔ اس کمرے کی دیواروں پر میرے تخیل نے ان گنت تصویریں کھینچی ہیں۔ جنہیں صرف میں ہی دیکھ اور پہچان

سکتا ہوں کیونکہ وہ تصویریں ہیولانی وجود رکھتی ہیں اور ہوا میں تحلیل ہو کر دیواروں سے لپٹی رہتی ہیں۔ لوک کہانیوں کی کون سی پری ہے جو اس کمرے میں نہیں آئی اور جس نے میری چارپائی پر بیٹھ کر مجھ سے باتیں نہیں کیں ہیں۔ انار شہزادی سے لے کر وش کنیا تک کے مہکدار سانس اس کمرے میں مجھ سے مس ہوئے ہیں۔

لیکن---- اب یہ کمرہ مجھ سے چھینا جا رہا ہے۔ کنبے کے پھیلنے بڑھنے کے ساتھ یہ گھر چھوٹا لگنے لگا ہے۔ پچھلے دو سال سے میری بیوی اس کمرے کو دوسرے کمروں میں ملا دینا چاہتی آرہی ہے۔ وہ مجھے گھر کے اوپر نئے چوبارہ میں اک دوسرا کمرہ دینے کی خواہشمند ہے۔ میں نے یہ کمرہ چھوڑنا نہیں چاہا جیسے یہ مجھ میں سمایا ہوا ہو اور میں اس میں لیکن کچھ دنوں سے اس کمرے میں صوفے بچھ گئے ہیں' میز اور کرسیاں آبراجی ہیں۔ پرانی نشانی یا دیواریں ہیں یا کتابیں۔ میرا پلنگ جو اب تک میرے تخلیقی عمل کا سٹیج بنا رہا ہے' اب دوسرے کمرے میں چلا گیا ہے۔ میری کچھ چیزیں اوپر چوبارہ میں جا سوئی ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں دراڑ دراڑ ہو گیا ہوں' ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا ہوں----

امروز 1926

۱۹۲۶ء کے جنوری مہینے کی ۲۶ تاریخ---- میرے لئے روز اول تھی- گاؤں سوہیاں کلاں میں وہ کمرہ' دادی کا تھا اور کمرے میں حاضری ماں اور دایہ کی تھی- اس لئے میرا پہلا کمرہ ماں کی کوکھ کے بعد ماں کی گود تھی جہاں میں نے آنکھیں کھولیں-

اور یہاں سے میرا کمرہ کا سفر شروع ہوتا ہے- بات یہ تھی کہ سوہیاں کلاں والی دادی روح کے رشتہ سے میری دادی تھی اور میرے والد کی روح کے رشتہ سے ماں جو لہو مانس کے رشتہ سے میری دادی تھی اور والد کی لہو مانس کے رشتہ سے ماں تھی- وہ چک نمبر چھتیس میں رہتی تھی- دونوں دادایاں سگی بہنیں تھیں- ایک نے میرے والد کو پیدائش دی تھی' دوسری نے میرے والد سے اپنی گود بھری تھی- دونوں کے حق محفوظ تھے---- اس لئے میری ماں جماد امید سے ہوئی' وہ ایک دادی کا گھر تھا اور جہاں دردزہ شروع ہوا' وہ دوسری دادی کا گھر تھا---- سو ماں سوہیاں کلاں سے مجھے گود میں لے کر جب بار کے چک نمبر چھتیس میں آ گئی' اور جب میں نے ہوش سنبھالا---- دیکھا---- اناج کی کوٹھڑی سے لگتا ہوا صرف ایک ہی بڑا سا کمرہ تھا جہاں اماں ابا' بھائی بہن سب ایک سے ساجھی دار تھے.....

جسے "میرا کمرہ" کہا جا سکتا ہے' وہ میں نے اٹھارہ برس کی عمر میں پہلی بار دیکھا تھا---- لاہور کے آرٹ سکول کے ہوسٹل میں' جب میں تیسرے اور آخری سال میں پہنچا تھا- ہوسٹل کے پہلے دو سال ہر کسی کو کسی دوسرے کے ساتھ مل کر بتانے ہوتے تھے-

ہوسٹل میں آتے ہی مجھے جس ساتھی کے ساتھ کمرے میں حصہ بٹانا پڑا تھا' وہ مسلمان تھا۔ میں جب اپنی چارپائی بچھا کر' شام کو فٹ بال کھیل کر واپس آیا تو دیکھا۔۔۔۔ میری چارپائی کے سرہانہ اور پائنتی کا رخ بدلا ہوا ہے۔ میں نے چارپائی کا رخ پھر تبدیل کر لیا کیونکہ مجھے سرہانے کی طرف بجلی چاہئے تھی۔ اور اسی طرح چارپائی کو پھر سے بچھا سنوار کر میں کھانا کھانے چلا گیا۔ مگر جب کھانا کھا کر آیا تو کھاٹ کا سرہانہ اور پائنتی پھر بدلے ہوئے تھے۔ میں نے پھر اس کو سیدھا کر لیا اور جب میرا کمرے والا ساتھی آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ میری کھاٹ کا رخ کون بدلتا ہے؟ اس نے کہا کہ تمہاری چارپائی کی پائنتی مغرب کی طرف نہیں ہونی چاہئے کیونکہ مغرب کی طرف مکہ شریف ہے۔ میں نے کہا مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ مغرب کی طرف پائنتی نہیں کرتے مگر مجھے اپنا سرہانہ روشنی کی سمت میں چاہئے' پڑھنے کے لئے! اس نے گو اگلے دن کمرہ بدل لیا لیکن اس کی تکرار سے میرے ذہن میں اکیلے کمرے کا تصور گھر کر گیا جس میں مشرق و مغرب دونوں اپنے ہوں۔

آرٹ سکول کے تین سال پورے ہو گئے تو ہوسٹل چھوڑنا پڑا۔ مگر باہر کمرے کا انتظام ابھی نہیں ہوا تھا۔ اس لئے جب رات اترنے لگی تو میں نے سٹیشن پر جا کر لاہور سے گوجرانوالہ کا ٹکٹ خرید لیا۔۔۔۔ گوجرانوالہ کا اس لئے کیونکہ اس وقت گاڑی اس طرف کی ہی تیار تھی۔ اس طرح گاڑی کا تیسرے درجہ کا ڈبہ بھی ایک رات کے لئے میرا کمرہ بنا تھا۔ گوجرانوالہ پہنچتے ہی لوٹنے کے لئے لاہور کا ٹکٹ خرید لیا اور جب سویرا ہوا تو میں واپس لاہور میں تھا۔

یوں تو میں اپنے کمرے کی تلاش میں ایک شہر سے دوسرے شہر گھومتا پھرا تھا' وہی رات کو "میرا کمرہ" ہو جاتا تھا۔ کمپنی نئی تھی' عمارت بھی نئی تھی' بجلی ابھی نہیں لگی تھی' اس لئے کمپنی سارا کام دن کی روشنی میں نبٹاتی تھی۔ جب رات اترتی تھی' کمپنی والے غائب ہو جاتے تھے اور میری طرح وہ جگہ بھی اکیلی رہ جاتی تھی۔ سو میں اس تنہا جگہ میں موم بتی جلا کر اسے "اپنا" بنا لیتا تھا۔

ملک کا بٹوارہ ہو گیا تو کمرے کی تلاش میں دلی آ گیا۔ پھر دلی نے مجھے

کنگزوے کیمپ کی بیرکوں میں خوش آمدید کہا جہاں ایک بھیڑ کا حصہ بن کر جینا اور سونا ہونا تھا---- دلی کی جے' ولٹر تھامسن کی شاخ میں جب مجھے چھوٹی سی نوکری ملی تو کمپنی کے منیجر نے پیشکش کی کہ اگر میں کیمپ سے نجات پانا چاہتا ہوں تو مجھے دفتر کا سٹور' رہنے کے لئے مل سکتا ہے۔ وہ چھوٹا سا سٹور یقیناً کیمپ سے بہتر تھا۔ یہاں میں رات کو اکیلا سو سکتا تھا.....

پھر کوئی دس برس بعد والٹر تھامسن کی دلی والی برانچ بند کرنے کا حکم آگیا۔ منیجر نے نئی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھول لی جس سے میری نوکری بنی رہی لیکن رہنے والا سٹور میرے پاس نہ رہا۔ اسی منیجر نے اپنے گھر کا سٹور مجھے رہنے کے لئے دے دیا---- اور یوں ایک سٹور میرے سٹور میں بدل گیا۔

پھر ایک سال بعد میں دلی چھوڑ کر بمبئی چلا گیا جہاں کام تو مل گیا پر رہنے کے لئے جگہ نہیں ملی۔ وہاں میرے ایک ہم جماعت کا بڑا بھائی صوبیدار تھا جس کے برآمدے میں میں چارپائی ڈال کر رات کو سو جاتا تھا۔ بمبئی سے ایک بار پھر دلی آگیا تھا' لیکن لوٹ کر جب پھر بمبئی گیا' لاہور کے ایک شناسا آرٹسٹ سے ملاقات ہو گئی۔ اس کے چھوٹے سے فلیٹ میں اس کے ایک اور دوست کا کنبہ بھی ٹھہرا ہوا تھا' اس لئے اپنے کمرے کی تلاش کا وقت میں نے اس عمارت کے اوپر کے زینے میں کاٹا.....

کمرہ نہیں' کمرے کا ایک کونہ پچاس روپیہ ماہوار کرایہ پر مل گیا۔ کمرہ ایک فوٹوگرافر کا تھا مگر اس کا کام ٹھیک سے نہ چلتا تھا۔ اس نے اپنے کمرے میں میری کام کرنے والی میز ڈالنے کی جگہ مجھے کرایہ پر دے دی۔ مگر جب کبھی کبھار کوئی فوٹو کھنچوانے کے لئے آتا تھا' مجھے کمرے سے باہر جانا پڑتا تھا۔ صرف ایک بات غنیمت تھی کہ رات کو کوئی فوٹو اتروانے نہیں آتا تھا' اس لئے اپنی میز والی جگہ پر میں بستر بچھا کر رات بھر چین سے سو سکتا تھا۔ تاہم ایک حادثہ اس کونے میں بھی وقوع پذیر ہو گیا۔ میں نے ایک فلم کے لئے کام کیا تو مجھے اکٹھے ایک ہزار روپے ملے۔ میری برسوں کی تمنا تھی' ایک ریڈیو گرام خریدنے کی' مگر جب میں نے ریڈیو گرام کا ذکر

کمرے کے مالک سے کیا تو اس نے بالکل منع کر دیا کہ میں ریڈیو گرام نہیں لا سکتا۔ اس کے لئے لائیسنس لینا ہوتا تھا اور لائیسنس پر پتہ درج ہوتا تھا۔ اس نے کہا' آپ کمرے کو کونا استعمال کر سکتے ہیں مگر میرا ایڈریس استعمال نہیں کر سکتے۔ یہاں سے میرے دل میں اس کمرے کی تمنا جاگی جہاں میں جو چاہوں' خرید کر لا سکوں اور جو میرا پتہ بھی بن سکے۔

ایسا ایک پورا کمرہ مجھے ۱۹۵۲ء میں پہلی بار ملا۔ مگر یہ پورا کمرہ بھی ایسا تھا جس کے لئے کوئی غسل خانہ نہیں تھا۔ وہ جس مکان کا کمرہ تھا' اس کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا تھا' غسل خانہ استعمال کرنے کے لئے۔ لیکن اس گھر میں رہنے والا خاندان کتنا بڑا تھا کہ غسل خانے کا دروازہ کبھی اتفاق سے ہی کھلا ملتا تھا۔ رات کے وقت تو گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا.....

کوئی ایک برس بعد میں پھر دلی آ گیا' اردو کے ماہوار رسالہ "شمع" میں کام کرنے کے لئے۔ تب دور کے ایک رشتہ دار کے گھر مجھے ایسا کمرہ مل گیا جس کے ساتھ غسل خانہ بھی تھا۔ مگر اس کمرے کا المیہ یہ تھا کہ گھر کے میاں بی بی کی آپس میں بنتی نہیں تھی' اس لئے کبھی سبزی جلی ہوئی ہوتی تھی اور کبھی دال کچرا' دھوآنسی ہوئی۔ میں چونکہ پیئنگ گیسٹ تھا' کھانا بھی انہی کے ہاں کھانا پڑتا تھا اور وہ جلی ہوئی دال بھاجی میرے گلے نہیں اترتی تھی۔ اور پھر رات کو دیوار کے مساموں سے گزر کر میاں بی بی کی جو نوک جھونک کانوں پر پڑتی تھی' وہ "میرے کمرے" کے تصور کو پراگندہ کر دیتی تھی۔ اس کمرے میں میں مشکل سے ایک مہینہ کاٹ سکا۔

اس کے بعد جس کرائے کے کمرے کو ڈھونڈ کر میں نے اپنا کمرہ بنایا' وہ میرا گھر لینے سے پہلے آخری کمرہ تھا۔ وہ ۱۳- ساؤتھ پٹیل نگر کا ایک کمرہ تھا' ایک کوٹھی کی کافی بڑی سی برساتی' اور برساتی کے آگے بہت بڑی چھت اس کمرے کا اپنا غسل خانہ بھی تھا اور اپنی رسوئی بھی۔ اس کمرے سے صرف سڑک پار ـــــ امرتا رہتی تھی۔ وہاں جب امرتا سے تعارف ہوا' دوستی ہوئی' محبت ہوئی تو ایک قیامت جیسی بات ہو گئی کہ نہ میرے سر پر کوئی چھت رہی اور نہ امرتا کے سر پر!

اس قیامت کے بعد جب خدا نے پھر دنیا تخلیق کی تو ہمیں لگا کہ اب ہم کو اپنا گھر مل گیا ہے۔ یہ گھر حوض خاص والا گھر ہے جس کی ستر فٹ لمبائی کے ایک سرے پر میرا کمرہ ہے' دوسرے سرے پر امرتا کا۔ چڑھتے سورج کو میرا کمرہ خوش آمدید کہتا ہے اور ڈھلتا سورج امرتا کے کمرے کو الوداع کہہ کر جاتا ہے۔

میں نے اپنے کمرے کے بارہ میں جب بھی سوچا' اسے اپنے جیسا ہی سوچا ہے' کھلا ہوا' سادہ اور صاف جسے آسانی سے رکھا اور پرکھا جا سکے۔ ضرورت کی ہر شے اس میں ہو لیکن کسی نمائش کے بغیر۔ اس کا اپنا ہی اک وجود ہو اور اپنا ہی اک رنگ---- اپنے آپ میں اپنا سب کچھ۔

میرے کمرے کا جو بھی میرا ذہنی تصور تھا' وہ اس کمرے میں آکر حقیقت بن گیا ہے۔ اگتے ہوئے سورج کی جانب کھلتی ہوئی ایک پوری دیوار جتنی بڑی کھڑکی ہے۔ جس پر پردے کی جگہ سیندوری پھولوں والی ایک بیل کی اوٹ ہے۔ کبھی کبھی چڑیاں بیل کی جھولتی ٹہنیوں میں گھونسلے بنا لیتی ہیں۔ اسی کھڑکی کے سامنے میری کام کرنے کی میز ہے۔ اور میز کے داہنے ہاتھ کی دیوار کے ساتھ لگا ایک ریڈیو گرام رکھا ہے اور ایک ٹیپ ریکارڈ۔ اور ان کے ذرا اوپر اسی دیوار پر لکڑی کے ہرے رنگ کے پتوں سے دن اور تاریخیں بدلتی ہیں۔ اور ان دنوں اور تاریخوں سے ذرا اور اوپر ایک بڑی دیوار گیر گھڑی ہے---- آفتابی رنگ کی گھڑی جس میں صرف سوئیاں ہیں' ڈائل نہیں---- ڈائل کی جگہ ایک پوری نظم ہے' ایک سے دو وقت بتلائی ہوئی گھڑی---- بائیں جانب کی دیوار پر ایک سیاہ پینل ہے جس پر جو بھی عمدہ شعر سنتا ہوں' پڑھتا ہوں' اس کو لکھ دیتا ہوں۔ پینل کے برابر سپید رنگ کا بیڈ ہے جو دیکھنے میں ایک سپید چبوترہ سا لگتا ہے۔ یہ لکڑی کا چبوترہ میرے کاغذات' کتابیں اور کمبل رضائی اس طرح اپنے آپ میں سمیٹ کر رکھتا ہے کہ کمرہ خواب گاہ بھی ہے اور سٹوڈیو بھی۔ ایک دیوار میں الماری ہے جس کے آئینے پر صورت دیکھنے کی جگہ کو چھوڑ کر سرخ رنگ سے ایک پوری نظم رقم کی ہوئی ہے۔

یہ میرا کمرہ یوں تو اٹھارہ فٹ' چودہ فٹ کا ہے مگر پورے گھر کی ستر فٹ لمبی

پانچ کمروں کی جگہ مجھے ایک ہی کمرہ لگتی ہے---- اپنے گاؤں والے کمرے کی طرح جس میں میرے سبھی رشتہ دار رہتے تھے۔

وہ میرے سبھی رشتے اب بھی ہیں مگر میرے اور امرتا کے وجود میں۔ دنیا کا کوئی رشتہ نہیں جو میرے اور امرتا کے رشتے میں شامل نہیں ہے۔

اسی لئے ستر فٹ لمبے کمرے کا ایک سرا میرا سٹوڈیو ہے لیکن دنیا کے بہترین شعر میں نے ساری دیواروں اور دروازوں پر لکھے ہوئے ہیں۔ وہ بھی جو پرلا سرا امرتا کا کمرہ ہے' درمیان میں وہاں بھی جس حصے کو نشست گاہ کہتے ہیں' ادھر کی جانب وہاں بھی جو ناگ منی کا کمرہ ہے اور ساتھ لگی ہوئی رسوئی ہے اور نیچے اترنے اور اوپر جانے کی سیڑھیاں ہیں.....

سیڑھیوں میں پھول پتے' شعر اور کھڑکیوں کے آئینوں پر بنی ہوئی تصویریں---- اس راہ کی سجاوٹ ہیں جو نیچے اترتے ہوئے روح کی گہرائیوں میں اترتا ہے اور جو اوپر چڑھتے ہوئے روح کی بلندیوں کی طرف جاتا ہے.....

دیویندر 1926

پتہ نہیں کیوں' اردو کا ایک شعر یاد آ رہا ہے---- جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے!..... کیا کروں' یہ دل ہے۔ کمرے کی بات سوچتے سوچتے کسی گرم کونے کی بات سوچنے لگتا ہے جیسے میں کسی گرم' اندھیری غار میں الٹا لٹکا ہوا ہوں اور میرے اندر "ھوم' ہری اوم" کی صدا اٹھ رہی ہو..... کبھی "اللہ ہو' اللہ ہو" کا ورد کر رہا ہوں اور میرے ہونٹوں پر "اک اونکار' اک اونکار" آئے جا رہا ہے۔ اس تاریک اور گرم غار کی دیواریں بڑی نازک ہیں مگر میرے حلق میں ایک کانٹا اڑا ہوا ہے اور بدن ایک سنسان جنگل جیسی گوشت کی غار میں الٹا لٹکا ہوا ہے۔

میں گھبرا کر کبھی "ہری اوم" کہتا ہوں' کبھی "اللہ ہو" کرتا ہوں اور کبھی "اک اونکار' ست نام' کرتا پرکھ' نہ بھو' نر ویر اکال مورت..." اکال مورت ہوں تو میں الٹا کیوں لٹکا ہوا ہوں؟ شائد اس لئے کہ میں ابھی پوری تخلیق نہیں ہوں' ادھوری تخلیق ہوں۔ خالق بننے کے لئے تو ابھی کئی حدود پار کرنی ہیں۔ خالق تو وہ ہے جس کے جسم کی اندھیری کوٹھڑی میں میں ایک مجرم کی طرح الٹا لٹکایا گیا ہوں۔ کیا سمادھی کے لئے ایسی کوٹھریوں میں ہی لٹکانا پڑتا ہے؟ کیا کبھی میں اس کال کوٹھری سے نکل کر روشنی کی کرن کو چوم سکوں گا؟

نہیں نہیں' یہ کوٹھڑی تو میری ماں کے بدن کا ایک حصہ ہے جہاں دو روحیں' دو دھڑکنیں سانجھی کرتی ہیں۔ یہ میری ماں کا دل ہے جہاں کوئی ہاتھ رکھ کر کہتا ہے' "یہاں تو دو دل دھڑک رہے ہیں' ایک دل اپنے مقام اور ایک یہاں۔" نیچے میں دب سا جاتا ہوں۔ یہ ہاتھ میرے والد کا ہے۔ اس ہاتھ کے لمس سے مجھے

جھنجھنی سی آئی، شائد کپکپی سی!

ہاں، رات اسی طرح ہوئی ہو گی۔ میں نے بھی پہلی بار اسی طرح پوچھا تھا جب ماں جی (دادی ماں) میں اور میری رانو (بیوی) ایک برساتی میں رہتے تھے۔ قرول باغ ویسٹرن ایکسٹینشن میں۔ دادی ماں اور میں والد سے ناراض ہو کر الگ رہنے لگے تھے۔ یہاں میں اپنی من مانی کر لیتا تھا۔ سوبھا سنگھ کی نام خماری، چغتائی، اندرجیت کی تصویریں اور اپنی بنائی ہوئی تصویروں سے کمرے کو ایک سرے سے دوسرے تک بھر دیا تھا۔ کتابیں تھیں، چارپائی کے نیچے، اور الماریوں میں۔ کمال کی جگہ تھی۔ بس، ۱۰x۱۰ کا کمرہ جہاں ہم تینوں سویا کرتے تھے۔ کمرے کے باہر کھلی ٹیرلیس تھی۔ یہاں سبھی کچھ تھا۔ مگر میری جلد باز یک لیع ادت کی وجہ سے وقت پر وہاں کچھ بھی نہیں ملتا تھا۔ یہیں میری محبوبہ اور میرے دوستوں کو آکر چین نصیب ہوتا تھا۔ یہیں میں نے حد انتہا تک بڑھی ہوئی، لمبی بے خوابی کے بعد سونا سیکھا تھا۔ یہی وہ کمرہ ہے جہاں میں پڑھتا پڑھاتا، لکھتا۔ اور اداس ہوا کرتا تھا۔ چڑھتے سورج کی دھوپ بھی یہاں آتی تھی اور ڈوبتے سورج کی لالی بھی یہاں سے ہو کر جاتی تھی۔ یہیں پر اداس شاموں کی طرف منہ کر کے "گیت اور پتھر" کے افسانے لکھے، "خوشبو" ناول تحریر کیا اور ایک کتاب "قلم کا بھید" شروع کی۔ مگر یہ ۱۰x۱۰ کا کمرہ سب سے پہلے کیوں آگیا ہوے، گھس پیٹھ کر کے؟ کیا یہ سب سے لاڈلا ہے؟

میرا پہلا کمرہ تو لاہور کے بازار بھاٹی دروازہ کے محلہ جلوٹیاں کی حویلی نمبر دی۔ ۱۲۳۰ء میں تھا جس کے مرمری فرش تھے، سرخ، سیاہ اور سپید! بیٹھک کے برابر دودھ ایسے سپید فرش والا کمرہ میرا تھا جہاں میں اور میرا چھوٹا بھائی سندی (سریندر) دادی ماں کے ساتھ رہتے تھے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر دعائیں مانگتے تھے۔ کنڈے پیر کے آگے ریوڑیاں چڑھاتے تھے کہ والد، لال لال آنکھوں والے والد، زور زور سے کڑک کڑک کر بولنے والے والد کی تبدیلی دور افتادہ شہروں میں ہوتی رہے جیسے کسولی، دھرمسالہ، چمن، لورالائی، میرٹھ، پونا..... اور ہم جی بھر کر اپنے اپنے کمرے میں کیرم اور شطرنج کھیلیں، میٹنی شو دیکھیں---- جن کی وجہ سے سال کے پہلے

تین امتحانوں میں انگریزی اور اردو کے سوا ہر مضمون میں بری طرح سے فیل ہوں اور سالانہ امتحان ہیں انگریزی اور اردو میں ناموری حاصل کر کے باقی مضامین میں اچھی طرح سے پاس آتے رہیں۔ والد اور اماں کے سارے پروگراموں کو مٹی میں ملاتے رہیں۔ ہمارے بارے میں ان کے پروگرام ایسے ہوتے تھے۔

"اگر تم سالانہ امتحان میں فیل ہو گئے تو میلے میں حلوائی کی دوکان پر برتن مانجھنے کے لئے بٹھا دوں گا۔ تم آوارہ لڑکوں کے ساتھ کھیلنے سے باز نہیں آتے۔۔۔۔ اگر انہوں نے تمہیں بھی اپنے ایسا نالائق نہ بنا لیا تو کہنا۔ تم کبھی پاس نہیں ہو سکتے۔ آخر میں تم مندے قضائی کی دوکان پر بیٹھو گے!"

یہ الہامی جملے اپنے کمرے میں سکڑ سکڑ کر سننے کے لئے ہم کو ہر سال تیار ہونا پڑتا۔ آہستہ آہستہ اس کے خوگر ہو گئے ہم۔ لیکن سلامت رہے۔ وہ ۱۲x۱۵ کا مرمری فرش والا کمرہ جس کی اک اک دیوار ہمیں تسلیاں دیتی اور مسکرانے پر مجبور کرتی۔ مشرقی دیوار کے ساتھ لٹکے ہوئے بیضوی آئینے میں ایک بار اپنا بگڑا ہوا چہرہ دیکھ کر ہم کھلکھلا کر ہنس پڑے تو ماں نے ہمیں کھڑاؤں سے پیٹا حالانکہ ہم تو اپنے آپ پر ہنسے تھے۔ یاس میں چہرہ لمبوترا ہو جاتا ہے۔ ہنسی رکتی ہی نہیں تھی۔ ان دنوں بات بات پر ہنسنا اور مار کھانا' ہمارا وہ کمرہ اس کا گواہ ہے۔ زندہ یادوہ کمرہ جس میں نام نہاری والی تصویر تھی۔ دوسری دیوار پر بابا نانک مسکرا رہے تھے' الٰہی مسکراہٹ باقی دیواریں ابھی برہنہ تھیں۔

وقت بیتنے کے ساتھ ساتھ ہم نے اس کمرے کو ایشور' چغتائی اور شیر گل کی تصویروں سے سجانا شروع کر دیا۔ میو سکول آف آرٹس کی سالانہ نیلامی میں وینس کا بت لا کر ٹکا دیا۔ ایک کباڑی سے انسائیکلوپیڈیا برٹینکا دس روپے میں خرید کر لائے اور اپنے آپ کو عالم و فاضل سمجھنے لگے۔ اچھی بری تالستائے' ٹیگور اور اقبال کی پورٹریٹس بنا کر اور عمدہ فریم لگا کر دیواروں پر لٹکا دیں۔ لینڈ سکیپوں کی تو بھرار تھی۔ اسی کمرے میں بشیرے سے ملا حسین حلوائی سے پنیاں منگوا کر کھاتا تھا کیونکہ ہندو سکھ حلوائی دام زیادہ اور پنیاں دن بہ دن چھوٹی کرتے جا رہے تھے۔ ساتھ ہی

ماں اور بھائی کا دھرم بھرشٹ ہوتا تھا۔

اسی کمرے میں بشیرا روز مجھے نئے اور پچاس فی صدی سچے عشق کی داستانیں آہوں اور آنسوؤں کے بیچ سنایا کرتا تھا۔ ان کو سن کر میرا دل بھی کسی بڑی حسنی دوشیزہ سے جی بھر کر محبت کرنے کے لئے مچل اٹھتا تھا۔ یہیں میں نے سب سے پہلے کنڈے پیر کے آگے ریوڑیاں چڑھائیں اور منت مانی کو ہماری ایک شاعرہ لڑکی سے ملاقات کرا دیجئے پیر جی' اگر آپ کو جی بھر کے ریوڑیاں کھانی ہیں!---- چمالے صاحب کے گوردوارہ میں جا کر امتحان پاس کرنے کے لئے ماتھا ٹیکتے ہوئے یہ دعا بھی کر ڈالی۔ سوچا' اگر پیر جی نے بات نہیں سنی تو چھٹے پاتشاہ تو کہیں گئے نہیں۔ یہ سب کچھ اسی کمرے میں بیٹھ کر کتاب عہدہ نامہ میں بھی لکھ ڈالا تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ اور ساتھ یہ اس کی کئی نظمیں لکھ دیں---- جیسے' "ہونٹھ میرے جوٹھے اور پیر تیرے سچے" حسن' شعر اور محبت کے اس سنگم کو ملنے کی تمنا ہے ہماری' نیلی چھتری والے! یہ آرزو پوری کر دے!"

ایسے بتوں کی عبادت ہی کی جا سکتی ہے' ان سے محبت نہیں کی جا سکتی۔ جیسے والد اور اماں سے پیار نہیں کیا جا سکتا' ان سے ڈرا جا سکتا ہے۔ پیار تو بشیرے سے کیا جا سکتا ہے جو پیار کی باتیں کرتے کرتے رونے لگتا ہے۔ پیار تو اس لڑکی سے ہی کیا جا سکتا ہے اور وہ بھی دل ہی دل میں' جو آپ کو اب پ کے پہلے سبق کی تعلیم دیتی ہے اور بچھڑتے وقت چندر کانتا کے پہلے چار حصے آپ کو تھما کر کہتی ہے کہ بس تمہیں زبان آئی کہ آئی---- پیار تو گول باغ' ٹھنڈی سڑک' حضوری باغ' ملکہ کے بت اور لیڈی میکلیگن کالج کے باہر ملنے والی اس سانولی سلونی لڑکی سے کیا جا سکتا ہے جس کے خطوط کی مہک سے آپ کا کمرہ معمور ہو جاتا ہے اور جس کی باتیں آپ اپنے کمرے کی دیواروں کے اتھ کرنے لگتے ہیں۔ پھر اس کمرے میں اور ماں کی کوکھ میں لٹکے بچے میں کیا فرق ہے؟ پہلے بھی قیدی تھا' کسی کے خطوط کے انتظار کا قیدی جو دہلیز پار نہیں کرتا! کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر جب میں قادر کا قصہ پورن بھگت پڑھتا----

رے رنگ محل تے چڑھ کے تے، رانی گاوندی غماں دے گیت لوکو!
میں تاں بھلی آں تیں نہ ہور کوئی لائیو جوگیاں نال پریت لوکو!
جنگل گئے نہ بہڑے سندراں نوں جوگی نہویں جے کسے دے میت لوکو!

یا میں ہری کا بند دہراتا---- لیا ہیر سیال جو یدو کریئے.... تو محلے کی کھڑکیوں کے کان پھڑپھڑانے لگتے۔ محلے کی شرمیلی لڑکیاں سوچتیں، نہ جانے ڈپٹی صاحب کا لڑکا کس فراق میں ہے۔

مگر بشیرا ہی نہیں، اس ۱۲ x ۱۵ کمرے کی اک اک ٹائیل جانتی ہے کہ ان میں کوئی بھی وہ نہیں ہے جس کے بارہ میں دندی بابو گیت گاتا ہے۔ یہ سن ۴۵، ۴۶ کے دن تھے۔

اچانک برابر کی بیٹھک میں بڑوں کی باتیں زور زور سے ہونے لگتی ہیں۔ باتیں تکرار میں بدل جاتی ہیں۔ یہاں ہر دن مہا بھارت چھڑا کرتی ہے۔ ہر پہلی تاریخ کو جب تنخواہ گھر آتی ہے، دونو آوازوں کی تندی ایک دوسری کو نیچا دکھانے کی سعی کرتی ہے۔

"یہ مکان، یہ حویلی میرے گھر والے کی، اور تم سب یہاں پسرنے ہی لگے---- نکلو میرے گھر سے!" میری دادی کی آواز ہے۔

"وئی! (گوردئی) یہ مکان میری کمائی سے بنا ہے۔ میں نے جو کمایا، پائی پائی لا کر چاچا جی (میرے دادا جی) کے ہاتھ پر رکھ دی۔ یہ چاروں مکان اسی سے بنے ہیں۔ تمہارے مکان تو مجھی ہٹے میں ہیں۔"

اچھا؟ رب کرے اس مکان کے نیچے سے آگے لگے اور اوپر تک جائے۔ یہ مکان تجھے نہ ملے میرے مرنے کے بعد!" دادی دہائی دیتی ہے۔

"وئی! میں اف نہ کروں، تم خوش ہو لو---- میری طرف سے یہ سارا لٹ جائے" والد کڑکتے ہیں۔

میں لرز لرز جاتا ہوں۔ میرا کمرہ ہل جاتا ہے---- یہ ماں بیٹے کیسی دعائیں مانگ رہے ہیں۔ میں سوچتا ہوں، میں اس گھر میں کاہے کو پیدا ہوا---- میرا کمرہ

کہتا ہے' میرے لئے!

"میں اس گھر کیوں آئی؟" ماں بلک کر کہتی ہے۔

میں سوبھا سنگھ' چغتائی اور شیر گل کی تصویروں میں پناہ ڈھونڈتا ہوں۔ ٹیگور' تالستائے اور اقبال سے ہمدردی کا طالب ہوتا ہوں..... میرا کمرہ کانپ رہا ہے..... جی چاہتا ہے' اس کمرے سے' اس گھر سے' اس شہر' اس دنیا سے بھاگ جاؤں.....

ہم سب کی خواہشیں پوری ہو گئیں۔ کہتے ہیں---- ہمارے چاروں مکان نذر آتش ہو گئے' ہم آزاد ہوئے تھے۔ ہم بھاگ کر سرحد پار کر آئے تھے۔ آگ کی لپیٹ میں وہ کمرہ بھی آیا ہو گا---- جس میں تالستائے' ٹیگور اور اقبال کے پورٹ ریٹس تھے' دیوی زہرہ (وینس) کے بت کی نہایت عمدہ نقل تھی۔ اللہ بخش چغتائی اور سوبھا سنگھ کی تصاویر تھیں۔

پہلے کچھ دنوں کے لئے دلی' پہاڑ گنج میں ایک مسلمان لوہار کی دوکان سے ملحقہ اک کچی کوٹھڑی ملی۔ شہر میں سردی بھی تھی اور خون کی مہک بھی۔ تاہم اندر حرارت تھی اور ننگے فرش پر سر کر ویسی ہی نیند آئی تھی۔ جیسی کوکھ سے باہر آکر بچے کو ماں کے ساتھ لگ کر آتی ہے۔ ایک ہمدم نے سویرے تڑکے ہی آکر جگایا اور گلے لگ کر بہت رویا۔ معلوم نہیں' وہ میری حالت زار پر رویا تھا یا ملک کے المیہ پر۔ سوچتا ہوں' مٹی میں کتنی حرارت ہوتی ہے۔ خواہ وہ جسم کی ہو یا زمین کی---- اپنے ساتھ میں لاہور سے جو کتابیں لے کر آیا تھا وہ تھیں' انعاموں میں ملی ہوئیں ایک کتاب چغتائی کی' شیکسپیئر کی ساری تصانیف' راشد کا ماورا' فیض کا نقش فریادی' وارث کی ہیر اور امرتا کی نظموں کا ایک مجموعہ۔

لیکن پیچھے جو چھوڑ آیا تھا' یادوں نے اس کمرے کو ویسے کا ویسا ہی سنبھال کر رکھا ہوا ہے---- جیسے بشیرا ابھی بھی ۱۸-۱۹ برس کا ہے۔ یادوں نے اس کو بوڑھا نہیں ہونے دیا۔

دلی کے اس کمرے نے بے خوابی سے بھری ہوئی یادوں میں بار بار سمجھایا---- بھئی' عشق و عاشقی کھایئے پیئے لوگوں کا شغل ہے۔ اگر کوئی خط نہیں

لکھتا تو نہ سہی۔ تم بجلی کے کھمبے سے لگ کر اس کی روشنی میں اپنی ایم اے پاس کرو۔۔۔۔ یہاں گھر سے کیمپ کالج اور کیمپ کالج سے گھر' یہی تمہاری بیٹ ہے۔

یہ کچا کمرہ سرکاری تحویل میں لے لیا گیا اور ایک دور کے رشتہ دار نے ساٹھ روپے ماہوار پر اپنی بیٹھک خالی کر دی جس میں ہم چاروں بہن بھائی' ماں اور دادی رہنے لگے۔ باہر جافری میں نوکر سو جاتا تھا۔ یہاں میں نے "گیت اور پتھر" کی پہلی کہانیاں لکھیں۔ انہی دنوں "دو کنارے" افسانوں کا مجموعہ چھپا اور ایم اے انگریزی والی دشوار منزل طے کی۔

یہ بیٹھک ۸ x ۸ کا کمرہ تھی جہاں ہم اکٹھے سکڑ سکڑ کر سوتے تھے۔ ہولے ہولے ہنستے' گاتے اور لڑتے تھے۔ دادی کے لئے پھوپھی جان کے دلی آ جانے پر رہنا مشکل ہو گیا۔ میرے لئے تو تھا ہی۔ میں قرول باغ آ گیا۔ کالج جہاں میں پڑھاتا تھا' نزدیک ہو گیا۔

ویسٹرن ایکسٹینشن ایریا کے مکان کی یہ برساتی اب ہمارے پڑھنے' بیٹھنے اور سونے کا کمرہ تھی۔ اس کا ذکر میں پہلے کر آیا ہوں۔ یہاں دس سال بتا کر دو سال جالندھر اور پھر واپس پہاڑ گنج۔

یہاں بھی ہمیں برساتی ملی جو ۸x۸ کی ہے۔ لگتا تھا' کمرہ چھوڑا ہوتا جا رہا ہے اور مورتیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ڈالی اور پنکی ایک صندوق پر سوتی تھیں۔ ماں ایک کھاٹ پر' دوسری پر رانو۔ کتابیں' کپڑے' برتن' بستر' رسالے' تصویریں..... یہیں ہم چائے اور کھانا بناتے ہیں۔۔۔۔ اور بچے بناتے ہیں۔ ہولے ہولے لڑتے ہیں۔ میں کہانیاں اور ناول بھی لکھتا ہوں۔ شور شرابا یا غل غیاڑہ' میرا کچھ نہیں بگاڑتا۔ میرا تخلیقی عمل جاری رہتا ہے۔ ناٹک' کہانیاں' خط اور جواب اور ترجمہ جو تھوڑی بہت توجہ مانگتے ہیں' یہیں لکھ رہا ہوں۔ ماں نوکرانیوں کو قہر آلود نظروں سے دیکھتی ہے۔ لڑنے جھگڑنے اور زبان ہلانے اور موسہ کی خاموشی توڑنے کے لئے نیچے چلی جاتی ہے۔ بیٹے اور بہو سے لڑ جھگڑ کر' بہت بار بیت کر' اور کبھی کبھار ہار کر' اوپر برساتی میں آ جاتی ہے۔ برساتی کی لکڑی گلتی جا رہی ہے۔ دراڑیں اور

درزیں ہواؤں اور بوچھاڑوں کو خوش آمدید کہتی ہیں۔ مہینہ کی بوچھاڑ میں سارا کمرہ ہے پر ہمیں کوئی شکوہ نہیں ہے۔ سارے شکوے تو ایک دم نیچے کے دو مکینوں' والد اور اماں کو ہیں جن کے پاس چار کمرے' دو سٹور' غسل خانہ اور گورو گرنتھ صاحب کا الگ کمرہ اور صحن ہے۔ ان کے لئے جگہ تھوڑی ہے مگر ہم سات بندوں کے لئے برساتی بہت بڑی ہے کیونکہ اس سے ہم سبھی کام چلا رہے ہیں۔

میں اب دن بہ دن تلخ مزاج ہوتا جا رہا ہوں۔ وقت پر اس جگہ کچھ بھی نہیں ملتا۔ کاغذ معلوم نہیں' کہاں چلے جاتے ہیں۔ لکھے کوئی خاک؟ باہر جانا ہے' جوتے نہیں مل رہے۔ چابیاں جانے کہاں کھو گئی ہیں۔ میگزین میں نے پڑھے بھی نہیں اور آپ نے سنبھال کر رکھ دیئے ہیں کمال ہے!

عجیب کمرہ ہے یہ جہاں وقت پر کچھ بھی دستیاب نہیں۔ نہ کتاب' نہ کاغذ' نہ قلم۔ کبھی اپنا آپ بھی کھو جاتا ہے۔ عجیب کباڑ کی دوکان ہے یہ برساتی!

احباب پوچھتے ہیں---- تم' یار! گھر پر کبھی ملتے ہی نہیں!---- ان دنوں میں کافی ہاؤس میں' باغات میں شامیں بتا کر گھر آتا تھا---- اس دوران محبوب اور بچوں پر کیا بیتی' دیدی کے ساتھ کیا ظلم ہوئے' پتہ ہی نہیں۔ نہ کسی نے بتایا' نہ ہم نے پوچھا۔ امرتا پریتم کہتی ہیں' تم اپنے آپ کو غیر ذمہ دار کیوں کہتے ہو؟ بس' اس معاملے میں ہم بدتمیزی کی حد تک غیر ذمہ دار ہوئے ہیں۔ جب احساس ہوا---- تب پلوں کے نیچے سے بہت پانی بہہ چکا تھا۔

دادی اماں جب خدا کو پیاری ہوئیں تو مجھ سے کسی کے سامنے رویا ہی نہیں گیا۔ رانو کو دن رات یہی فکر کہ ماں کیا کہے گی' والد کیا سوچیں گے؟---- اور ہمیں چھینکے پر ٹانگ دیا' دو تین بار اشارہ بھی کیا۔ مگر وہ ہمیں ٹیگور اور تالستائے ایسا مہاتما سمجھتی رہیں۔ مگر ہم ٹیگور' تالستائے اور اقبال نہیں'---- دیویندر تھے۔ سو اگر تخلیق کی کچھ بلندیوں کی طرف مونہہ کیا تو ٹھوکر کھا کر ایک آدھ کھائی کی بستی میں بھی گر پڑے۔ ساتھ ساتھ خوشبو' تین راتیں' پل کا مسیحا' تھکاوٹ..... بھی لکھے گئے۔ لیکن سوز و غم کے انہی دنوں میں میں نے "آخری کش" بھی لکھا'

"دوسرا میں" لکھا۔ پنجابی میں بے تحاشہ لکھے ناٹکوں کا تو کہنا ہی کیا۔ وہ تو کھڈی پر جولاہے والا کام ہے جو پاپی پیٹ اور کمپنی کے نام کے لئے کرنا ہی پڑتا ہے۔

مگر اس آٹھ بائی آٹھ کی برساتی نے مجھے کیا کچھ دیا کیا چھ کھویا' یہ بہت اداس کرنے والی اور بہت ہنسانے والی داستان ہے۔ مگر میں سوچتا ہوں' بارش کی بوچھاڑ میں' رعد کی کڑک اور آگ برسانے والی لوؤں اور جھلسا دینے والی دھوپوں میں جو وفا اس کمرے نے ہمارے ساتھ نبھائی ہے' ہم اس کا قرض نہیں چکا سکتے۔ میں جو کچھ بھی ہوں' دیویندر' افسانہ ناگر' براڈ کاسٹر' برکتے اور سائیں لوک کا دندی شاہ' اور امروز کا بھائی گیٹ' سب کچھ اس کمرے کی بدولت ہے۔ جب تلک اس کی وفا قائم ہے' میں لکھتا' بولتا' لڑتا رہوں گا۔ جب یہ بھی دروازے بند کر لے گا تو ایک شام میں چوبلی برساتی کی دراڑوں میں سے دھواں بن کر نکلوں گا۔۔۔۔ فریاد بن کر بلند ہوؤں گا اور لمبی چڑوی منڈیروں پر سے نیچے کی طرف چھلانگ مار دوں گا.....!

اجیت کور 1934

کمرہ، کہنے کو تو کچھ نہیں، محض دیواریں اور چھت!۔۔۔۔ ایک دروازہ اندر جانے کے لئے اور باہر جانے کے لئے۔ بڑا ہی کرم ہوا تو شائد اک آدھ کھڑکی بھی خالی جگہ میں کھڑی ہوئی، ایک دائرہ۔ بڑی چوڑی خلاء میں ایک چھوٹی سی خالی جگہ، گھری ہوئی دیواروں کے بیچ!

لیکن "میرا کمرہ" کہیں تو اس میں خواہ مخواہ تھوڑی سی حرارت گھل جاتی ہے، پانی میں مصری کی ڈلی کی طرح!

یعنی خلاء کا ایک ٹکڑا، دائرے میں لپٹا ہوا، گرم اور اپنا!

اپنا، کہوں تو ہنسی آتی ہے۔ یہ نہیں کہ میں کوئی فلاسفر ہوں۔ نہیں، دوستو! میں تو بہت سطحی قسم کی ہستی ہوں۔ ٹھوس زندگی کی عاشق!۔۔۔۔ ویسے سوچا جائے تو زندگی بھی کمبخت کیا شے ہے! سوچتی ہوں، کبھی اپنی کہانی لکھوں تو نام رکھوں۔ لائف از اے فورلیٹر ورڈ!

اب بتائیے، "کمرے" کی بات کروں یا "اپنے" کی بات؟

سب سے پہلی "اپنی" جگہ کوئی یاد ہے تو کوٹھے پر بچھی ہوئی بان کی ایک کھردری چارپائی، تھوڑی سی ڈھیلی ادوائنوالی، جس پر لیٹ کر یوں لگتا گویا کسی کی گود میں لیٹے ہوں۔ اور اوپر آسمان، پل پل بدلتے رنگوں والا..... اور شام کے وقت جبکہ آہستگی کے ساتھ سیاہی آسمان کی سپیدی میں گھلنے لگتی تو کوؤں کے جھنڈ سپید پگھلے ہوئے آسمان میں تانے بانے بنتے ہوئے چلتے۔ لگتا، اس پگھلی ہوئی گھڑی میں اس کھردری چارپائی کا آغوش جیسا ڈھیلا پن بہت اپنا ہے۔ خلا کا وہ ٹکڑا جو کوٹھے کی

دیواروں کے گھیرے میں لیٹا ہوا تھ' اور سپیدی میں گھلتی ہوئی نرم سیاہی والے عرش کے نیچے تھا' اور اس میں اپنے گھروں کو پلٹنے والے کووے اور میں' دونوں سالم و ثابت گواہ تھے اس گھڑی کے!

ذرا بڑی ہوئی' ایک چوبارے ایسا کمرہ مل گیا۔ اس کمرے کا ایک حصہ گلیارے میں کھلتا تھا۔ میرے کمرے کے برابر ہی اوپر جانے والی سیڑھیاں تھیں۔ پھر نیچے جانے والی' پھر غسل خانہ' پھر اندر کی بالکونی۔ اور گلیارے کے دوسری جانب دو بڑے کمروں کو جانے والے دروازے تھے۔ میرا کمرہ گویا ان سب راتوں کا پہرے دار تھا یا راستہ میں بیٹھا ہوا کوئی راہ گیر' تھکا ماندہ' آتے جاتے لوگوں کو چپ چاپ دیکھتا ہوا' الگ مگر سب کا گواہ عجیب اکیلا' مگر پھر بھی گھر کا حصہ۔ مٹی کی ایک مچھلی دیوار پر لٹکی رہتی۔ فرش پر چٹائی۔ الماری میں کتابیں' چھپا کہ پڑھنے والی پیچھے' دیوار کے ساتھ لگ کر لیٹی ہوئیں۔ سکول کی کتابیں آگے آگے ایک ساتھ رکھی ہوئیں۔ لیکن جب مہمان آ جاتے' وہ کمرہ مجھ سے چھین کر ان کو دے دیا جاتا۔

کمرے کا دوسرا سڑک کی جانب کھلتا تھا اور دروازے کے آگے مختصر سیت بالکونی تھی جس پر کھڑا ہونے کی ممانعت تھی۔ اس بالکونی والے دروازے پر ہمیشہ چلمن کی تیلیوں میں سے پار سڑک پر آتے جاتے لوگ' گھوڑا گاڑیاں او گڈے اور تانگے اور سائیکلیں اور کاریں دکھتیں۔ رات کو جب سبزی منڈی کی طرف جاتے ہوئے سبزیوں سے لدے پھندے گڈے گزرتے تو بیلوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی گھنٹیاں بجتیں اور چھکڑوں کے نیچے بندھی ہوئی لالٹینیں جھولتی ہوئی چھکڑوں کے پہیوں کی لکیروں اور گولائیوں کو سڑک پر منعکس کرتی چلی جاتیں۔

دوستو! اس کمرے میں بیٹھ کر' بتی گل کر کے' چلمن کی تیلیوں سے آنکھیں سٹا کر' چھکڑوں کے نیچے جلتی ہوئی لالٹینوں کی روشنی میں سائے جھولتے' چلتے' ساری سڑک پر پھیلے ہوئے' نرا بہشت تھے!

اسی کمرے میں ہی پہلے پہل میں نے کچی پکی نظمیں لکھنا شروع کی تھیں۔ ایسا کمرہ پھر کبھی نہیں ملا۔

اس کے بعد جو بھی کمرے ملے' ان میں گھٹن تھی..... بے انتہا گھٹن۔ کمرے کی دیواریں صرف خلاء کو گھیرنے کا ہی کام نہیں کرتیں' دوستو! انتہائی اعصابی کشیدگی کو بھی رسیوں کی طرح کمرے کے آر پار کس کر باندھنے کا کام بھی کرتی ہیں---- اور ان کسی ہوئی رسیوں میں ٹنگی ہوئی جان محض پھڑپھڑاتی رہتی ہے۔

بیاہ کے بعد بارہ برس میں جیسے سڑکوں کے فٹ پاتھ پر بیٹھی رہی۔ کمرہ تو تھا' مگر جب میرے شوہر گھر آتے ہیں اور میری دونوں بیٹیاں اس میں خرگوشوں کی طرح دبک جاتی تھیں۔ جب وہ گھر پر نہ ہوتے' وہ کمرہ زنداں ایسا لگتا' سلاخوں والی جیل گھر---- ہم تینوں سڑکوں پر بھٹکتی رہتیں..... حیران' کھوئی کھوئی.....

اور جب دل کرتا' میرے شوہر اس کمرے سے بھی ہمیں نکال دیتے تھے۔

اس کمرے میں صرف ایک چوڑا سا پلنگ تھا جس پر ہم تینوں تینوں دبک کر سو جاتی تھیں' ایک دوسری سے چپٹ کر اور اس پلنگ کے آس پاس اک عجیب سی دہشت دبک کر بیٹھی رہتی تھی۔

اس کمرے میں صرف سویا جا سکتا تھا' جاگ کر جیا نہیں جا سکتا تھا۔

پھر ایک کمرہ تھا جو ورکنگ گرلز ہوسٹل کی پہلی منزل پر ایک کونے میں تھا۔ فراخ کمرہ' اس کے سامنے برآمدہ۔ عقبی برآمدہ تو جیسے سڑک تھا' لوگوں کو آنے جانے کا راستہ۔ مگر سامنے والا برآمدہ ہمارا تھا جو رسوئی بھی تھا' سٹور بھی' کباڑ خانہ بھی' ہوا خانہ بھی!..... وہ کمرہ خواب گاہ بھی تھا' نشست گاہ بھی بچوں کا دارالمطالعہ بھی' اکھاڑہ بھی' کھیل کا میدان بھی'..... اور میرے لکھنے و ترجمہ کرنے کا مقام بھی! اس کمرے میں بیٹھ کر میں نے بہت کچھ لکھا---- رات کو دو دو بجے تک'..... اور ہر بار لکھ کر صفحات یک گنتی کی۔ دو روپے صفحہ کے حساب سے کتنے روپے' بنے!..... اور یا مضمون کے الفاظ گنے' کیونکہ تین ہزار الفاظ والے مضمون کے سو روپے ملتے تھے اور دس ہزار الفاظ کے اڑھائی سو روپے!

اس کمرے میں صرف مزدوری ہو سکتی تھی' اور ایک گھٹن ہانپ سکتی تھی'

اک چٹپٹاہٹ..... اور گہری' سیاہ' اندھی' بہری اوداسی!

پھر ایک چھوٹا سا گھر کرزن روڈ فلیٹس میں ملا- دو کمرے تھے- ایک کمرے میں نئے جاری کئے رسالہ کا دفتر' دوسرے میں گھر- پہلی بار دیواروں کے حصار میں چین آ بیٹھا- پہلی بار چڑھتی دھوپ سے کمرے میں حرارت آنے لگی اور ڈھلتی شاموں سے نرم خنکی---- پہلی بار اس کمرے میں کھلی' بے روک ہوا آنے لگی- اس کا جی چاہتا' آ کے بیٹھ جاتی' اس کا دل کرتا' ادھر سے آتی اور آنکھ مچولی کھیلتی ادھر سے باہر نکل جاتی-

اس کمرے میں بہت سی کہانیوں نے آنکھ کھولی- اس کی دیواروں کے بیچ نومولود بچے ایسے خیالوں کی تازہ اور ہلکی ہلکی کمائی سبکتی رہی گھٹنوں کے بل چلنے والے بچوں جیسی کہانیوں کی کلکاریاں تھرکتی رہیں.....

اس کمرے میں میں نے بے حد اداسی بھی دیکھی اور بے حد مسرت بھی---- جب دونوں بچیاں شملہ سکول کو چلی جاتیں' جب اوما جالندھر چلے جاتے تو اکیلی دیواریں بیابان جنگل بن جاتیں- مگر جب اوما دلیہ تے' اسی کمرے میں میرے ساتھ رہتے- اور جب بچے شملہ سے چھٹیوں میں آ جاتے تو وہی کمرہ سپنوں کا شیش محل بن جاتا' تاج محل!

اب یہ عالم ہے' دوستو! کہ ایک بڑا سا گھر ہے لیکن اس میں کوئی بھی کمرہ ایسا نہیں ہے جو صرف میرا ہو- ایک کمرہ ہے جس میں میں سوتی ہوں اور رات کے وقت پڑھتی ہوں- جب دارجی یعنی میرے والد میرے پاس آ کر رہتے ہیں' چار چھ مہینے' تو وہ کمرہ ان کا ہو جاتا ہے- اگر وہ نہ بھی ہوں تو جب کبھی کوئی مہمان آ جائے تو وہ کمرہ اس کی نذر کر دیا جاتا ہے-

لکھنے کے لئے کسی مخصوص جگہ کی حاجت نہیں ہوتی- کبھی دھوپ میں بیٹھ کر لکھتی ہوں' گاجریں گلہری کی طرح کترتی ہوئی' چائے پیتی' چنے چباتی- کبھی چلتی ہوئی کار میں- جب آپ بیٹھے ہوتے ہیں' مگر بیٹھے ہوئے نہیں ہوتے حرکت کر رہے ہوتے ہیں- ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہے ہوتے ہیں- سویرے' جب

ارپنا ابھی سوئی ہوئی ہوتی ہے' تو ڈرا ینگ روم ہی میرا کمرہ ہوتا ہے۔ چائے پیتے ہوئے صوفہ پر ٹانگیں گچھا کر کے گٹھڑی سی بن کر بیٹھنا اور لکھنا اچھا لگتا ہے۔ ویسے یہ کمرہ مجھے ہے بھی پسند! سویرے تڑکے سامنے پارکمیں جو پہلے چھوٹا سا جنگل ہوتا تھا' جب ہوا چلتی ہے تو سیدھی اس کمرے میں آتی ہے۔ صاف' پاکیزہ' ذرا ذرا پاگل ہوا۔ سپید' نرم اجالے سے بھری ہوئی۔

اس کمرے کے فرش پر ایک بہت پرانا' سادہ سا' گہرے سبز رنگ کا قالین بچھا ہے۔ پرانی بزرگ گھاس کے رنگ والا۔ صوفے کے بازو' ٹانگیں' گھٹنے سب لکڑی کے ہیں' قدیم سیکنڈے نیوین ساخت کے۔ گدیلے کے کپڑے جو چوکور خاکے ہیں۔ ایک ٹرالی ہے جس میں آرٹ کی کتابیں ہیں---- ارپنا کی! اوپر ایک چھوٹی سی ٹوکری میں مبارک باد کے کارڈ اور دعوتی کارڈ..... یادداشت کے لئے۔ جب وہ تاریخیں نکل جاتی ہیں تو وہ دفتر کے کمرے میں چلے جاتے ہیں اور ٹرے میں نئے کارڈ سج جاتے ہیں۔

دیواروں پر ارپنا کی نئی پینٹنگز آویزاں کی جاتی ہیں۔ تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد وہ بدلتی رہتی ہیں کیونکہ ارپنا لگاتار پینٹ کرتی رہتی ہے۔ لگتا ہے' اس کمرے کی صرف دیواریں سفر کرتی ہیں' شب و روز' ہر موسم میں' اور بدلتی رہتی ہیں۔ باقی سارا کمرہ ایک جزیرے کی طرح ساکن رہتا ہے---- اپنی قدامت لئے! صرف دیواریں بہتے پانی کی طرح رواں دواں رہتی ہیں۔

اس کمرے میں بہت سے جدید و قدیم' بیشتر ہندوستانی اور کم تر یوروپی' آرٹ پیس رکھے ہیں۔ ان میں گھر کر بیٹھنا اور لکھنا..... ہر خانہ بدوشی کو جھٹلانے کے لئے کافی ہے.....!

یوں یہ طے نہیں ہے کہ یہ کمرہ کب تک میرے پاس رہے گا۔ کمرہ تو خیر یہیں رہے گا صرف اس میں اس کی روح سمیت مجھے کوچ کرنا پڑے گا۔ یہ سفر ناتمام ہے' رائے کے مکانوں کی ابدی لعنت! اس مکان کے مالک نے بھی مجھے نکالنے کے لئے مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔ ہر مرتبہ یونہی ہوتا ہے۔ کچھ روز تو میں اڑ

کر بیٹھے رہتی ہوں، مگر پھر ایک دن ایسا آتا ہے جب دل یکایک اچاٹ ہو جاتا ہے، بے حد تھکن اور بیزاری گھر آتی ہے۔ شائد اسی کو بیراک (نفس کشی) کہتے ہوں گے۔ سوچتی ہوں، کیا فائدہ ہے؟ یہ کون سا اپنا گھر ہے۔ پرایا مکان اور اس میں ایک مسافر سی میں!..... خاص کر جب مقدمے کا فیصلہ میرے حق میں ہو رہا ہو اور مالک مکان کی آنکھوں سے خفگی اور جھلاہٹ مترشح ہوتی ہو، تب ایکدم یہ لاتعلقی سی آ جاتی ہے۔ آدھے منٹ میں فیصلہ کرتی ہوں اور باقی آدھے منٹ میں سارا گھر بیگانہ لگنے لگتا ہے---- اور پھر ایک نہ ختم ہونے والا سفر شروع ہوتا ہے، تھکن!---- نیا مالک مکان دریافت کرتا ہے، آپ کو اتنا بڑا مکان کیوں چاہئے؟ صرف دو ماں بیٹیوں کو پانچ کمروں کے مکان کی کس لئے ضرورت ہے؟ آپ کرایہ کہاں سے دیں گی؟ کمپنی لیز؟ آپ کی ملازمت؟ آپ کی آمدنی کا ذریعہ؟---- اور لگتا ہے جیسے کوئی میرا پیراہن نوچ رہا ہو۔

تب جی کرتا ہے، بندہ کسی جنگل میں ایک جھونپڑی ڈال لے۔ یہ جھونپڑی تو اپنی ہو گی، دائمی! ہمیشہ کے لئے! اور میں تو خانہ بدوش ہوں، دوستو!..... نو سیڈ!..... اپنے گھر کے تصور کی ہی دشمن،..... خانہ بدوش.....!

دلیپ کور ٹوانہ 1935

ایک بار ایک کہانی لکھی تھی، ''مر چکا!'' اس میں ایک لڑکی ایک بزرگ مصنف سے پوچھتی ہے، ''آپ کا نام کیا ہے؟'' تو انہوں نے کہا---- ''کرم لکریم، کیول، کن لوف، کستکھم، کچھ بھی ہو سکتا ہے، اور یہ سب بھی ہو سکیت ہیں''---- لڑکی غور سے ان کی طرف دیکھ کر اگلی بات پوچھتی ہے ''آپ کا گھر کہاں ہے؟''---- وہ جواب دیتے ہیں ''میرے دل میں!''

''آپ پھر جی کیسے رہے ہیں؟'' وہ گھبرا کر پوچھتی ہے۔

''کبھی پتہ بن کر، کبھی پرندہ بن کر، کبھی صبا بن کر، کبھی میں بن کر، کبھی تو بن کر...... وہ کبھی کبھی خدا بن کر!''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ کہتی ہے۔

''یہ ایسے ہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا، اگر میں صرف میں ہوتا تو اب تک کب کا مر چکا ہوتا۔''

اور ایسا کہنے والا مصنف کوئی بھی ہو سکتا ہے، آپ بھی ہو سکتے ہیں، میں بھی ہو سکتی ہوں---- اور امرتا پریتم جی کہتی ہیں، اس مصنف کے ''میرے کمرے'' کے بارہ میں کچھ لکھوں۔

اپنے آپ سے کنی کاٹنے سے کیسے چلے گا؟ سو عمر کے برسوں کو الٹا گھما کر میں اپنا کمرہ ڈھونڈنے چلی ہوں۔

ہال کمرے کے ساتھ والا کمرہ مجھے بچپن میں ہی مل گیا تھا۔ دیکھتی ہوں، اس کی ایک کھڑکی باہر، آنگن کے پار دکھائی دینے والے کھیتوں اور پیڑوں کی طرف

کھلتی ہے جس میں سے اڑتے ہوئے پرندے اور گزرتے ہوئے بادل بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس کمرے کا ایک دروازہ غسل خانے کی طرف کھلتا ہے۔ دروازہ ہمیشہ بند رہتا ہے مگر بہتے پانی کی آواز ہر وقت کمرے کے اندر منڈلاتی رہتی ہے۔ اس کا ایک دروازہ گھر کے اندر کھلتا ہے اور ایک دروازہ "بے جی" کے کمرے میں۔۔۔۔ گھر کے سب افراد بے جی کے کمرے میں جانے کے لئے اور بے جی خود بھی اپنے کمرے میں جانے آنے کے لئے دوسرا دروازہ چھوڑ کر میرے کمرے سے گزرتی ہیں۔ اس طرح وہ کمرہ، کمرہ کم اور شارع عام زیادہ بن گیا تھا۔۔۔۔ کیا یہ اسی وجہ سے تو نہ تھا کہ یہ ٹھنڈہ والے ہر بھجن کی نظم کہ "سانوں تاں اک ساتھ چلدیاں ڈنڈی نگری ہوئی"..... میں جب کہیں لکھنے لگی تھی تو لکھا گیا تھا۔۔۔۔ "سانوں تاں اک ساتھ چلدیاں نگری ڈنڈی ہوی!"

رات کو جب آوازیں بند ہو جاتیں تو بے جی بار بار کہتیں "سو جا، اب بتی بجھا دے۔ روشنی میں میری آنکھ نہیں لگتی۔" بتی گل کر کے میں اندھیرے کی طرف دیکھتی ہوئی بے جی کے سو جانے کا انتظار کرتی کہ پھر میں ہولے سے درمیان کا دروازہ بند کر کے بتی جلا لوں۔ بتی جلا کر میں نہ جانے کب تک پڑھتی رہتی، اور پھر لائٹ جلتی چھوڑ کر ہی سو جاتی۔

ایک بار دعا میں جڑے ہوئے دو حسین ہاتھوں کی تصویر ایک بڑھیا فریم میں جڑوا کر میں نے اپنے کمرے میں لگا لی۔ کچھ دن بعد، معلوم نہیں، کون وہ تصویر وہاں سے اٹھا کر لے گیا۔ کچی عمر میں دل بڑا توہم پرست تھا۔۔۔۔ لگا، میرے کمرے سے ہی نہیں، میری زندگی سے بھی، اور دنیا سے بھی، دعا میں بندھے ہوئے ہاتھ چوری ہو گئے ہیں۔

رات گئے کبھی دریچے کے آگے، کبھی ہال کمرے سے چھن چھن گھنگھروؤں کی مترنم آوازیں آتیں جیسے کوئی رقاصہ دبے پاؤں فرش پر چل رہی ہو۔ مالم نہیں، یہ کسی پرندے کی آواز تھی یا نرا کانوں کا بھرم تھا، مگر چھن چھن گھنگھروں کے ساتھ منسوب کہانی کہ کسی زمانہ میں کسی رئیس نے ایک نوجوان رقاصہ کو مار کر اسی

کوٹھی میں دبا دیا تھا' اور اس کی روح آج بھی کوٹھی میں چلتی پھرتی ہے..... میں نے سچ مان لی تھی۔ اور لگتا' شائد اسی کمرے میں وہ بد نصیب لڑکی دفن ہے۔ اور یوں وہ کمرہ اس کا بھی تھا---- زندگی اور موت کے بیچ کی لکیر کو پھلانگ کر اس کمرے میں کبھی وہ مجھ سے ملنے آ جاتی تھی اور کبھی میں اس سے ملنے چلی جاتی تھی۔

کچھ برس بعد ہم نے کوٹھی کے اوپر کچھ کمرے بنوا لئے۔ ان برسوں میں اپنے گھر اور اس میں اپنے کمرہ کا سپنا میری آنکھوں میں روشن بھی ہوا اور بجھ بھی گیا---- اور آنکھوں سے بہتے ہوئے پانی میں اس سپنے کے پورے رنگ بھی بہہ گئے۔

پتہ نہیں' کب میں ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔ جب میں ہی نہیں تھی' میری کسی ضرورت کسی آرزو کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ الگ کمرہ پھر کیا کرنا تھا؟ میری چہیتی امرتا کیلئے' جو اب امرتا گورم ہے' کہتی ہے "چاہے اسی سال کا بوڑھا ہو' یا آٹھ سال کا بچہ' تم اس سے یوں باتیں کرتی ہو جیسے وہ تمہاری عمر کا ہو یا تم اس کی ہم عمر ہو"---- یہی موقعہ ہے جب امرتا پریتم سے میں نے کہا تھا کہ بہت سے لوگوں کو خدا کہیں رکھ کر بھول جاتا ہے---- مگر میں نے شائد یہ ٹھیک نہیں کہا تھا۔ میں خود اپنے کو کہیں رکھ کر بھول گئی تھی۔ اسی لئے جب کوئی پوچھتا ہے کہ میں کیسے لکھتی ہوں تو میں ہنس کر کہہ دیتی ہوں---- کاغذ لے لیتی ہوں اور قلم لے لیتی ہوں اور بس لکھنا ہوتا ہے۔

آخر آپ خود سے کب تک بھاگتے رہیں گے؟---- کبھی تو کہیں بیٹھ کر سانس لینا چاہیں گے۔ انہی دنوں بہت بار ڈاکٹر کو بلانا پڑا تھا۔ جب دل ڈوبتا تو میں ڈاکٹر سے کہتی "ڈاکٹر صاحب! مجھے پورا سانس نہیں آتا۔"

جب پھوپھا جی نہ رہے' باپو جی نہ رہے' بے جی نے سوچا---- کوٹھی کے اوپر والے حصے میں رہائش لے لینا زیادہ محفوظ ہو گا۔ چھت پر ایک علیحدہ کمرہ مجھ کو مل گیا۔ اس میں خوبصورت الماریاں بنوائیں اور ان میں ساری کتابیں چن دیں۔

ایک طرف ریڈیو گرام کے پاس کتنے ہی ریکارڈ رکھ لئے۔ بیڈ لگا لیا۔ ٹیبل لیمپ سجا لیا۔ ایک دیوار پر سردار سوبھا سنگھ جی کی دی ہوئی سوہنی مہینوال کی پینٹنگ آویزاں کی' ایک جانب ایک عورت کی پینٹنگ نئے پردے لگائے۔ سوچا اک بڑھیا سا رائیٹنگ ٹیبل بھی لے آؤں گی۔

ہرا رنگ کر دینے کے بعد کمرہ بعد خوبصورت لگنے لگا تھا۔

مگر ایک دن میں کالج سے آئی تو دیکھا---- بے جی نے میری تمام چیزیں اٹھوا کر اپنے کمرے میں رکھوا لی ہیں کیونکہ اس کمرے میں گورو گرنتھ صاحب کا پرکاش کروا دیا تھا اور اگلے ماہ بھوگ ڈالنا تھا۔

جھلاہٹ تو ہوئی مگر اس جھلاہٹ کے لئے خدا سے معافی بھی مانگی۔ سوچا چلئے' اگر میرا کمرہ کسی کار نیک کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اور بھی اچھا ہے۔ میرا کیا ہے' میں تو کمرے کے بغیر بھی چلا لوں گی۔ مگر لگتا ہے۔ خدا نے میری یہ بات سن کر کہیں گانٹھ باندھ لی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ میری بہت سی چیزیں میرے ہاتھ آنے کے بجائے نیک کاموں میں لگ جاتی ہیں---- ایک کے بعد دوسرا' دوسرے کے بعد تیسرا اور تیسرے کے بعد چوتھا' گورو مہاراج کا بھوگ پاٹھ چلتا رہا اور اب وہ کمرہ مجھے اپنا کم اور گورو مہاراج کا زیادہ لگنے لگا۔ تاہم عمدہ رائیٹنگ ٹیبل خریدنے کی ضد میں نے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ کہیں پڑھا تھا---- اداکار مینا کماری نے اپنے شوہر کمال امروہی سے کہا تھا کہ مجھ کو صرف ایک سو روپے اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرنے کے لئے دے دیا کرو' پر وہ نہیں مانا---- یہ بات مجھے کیوں یاد آئی جبکہ مجھے پیسے کسی سے نہیں مانگنا ہوتے۔

باپو جی جب فوت ہوئے۔ بے جی کو غش آنے لگے۔ باپو جی کی موت کو جھیل کر بے جی کی بچوں کی طرح سنبھال کرنا پڑ رہی تھی۔ اس دوران بے جی نے نجانے کب اور کیسے مجھ سے جیسے اپنی بدل لی۔ اب گویا میں بے جی تھی اور وہ میری بیٹی تھیں۔ بے جی ہونے کے ناطے گھر کے سب کچھ کا قبضہ و اختیار اور ساتھ ہی بوجھ بھی میرے اوپر آ پڑا۔ بینک کی پاس بکیں مجھے تھما کر بے جی خود سرخرو ہو

گئیں- گاؤں سے ٹھیکہ آتا' کوٹھی کے نچلے حصے کا کرایہ آتا' میری تنخواہ آتی---- وہ نہ جانے' یہ سب کچھ کہاں کہاں خرچ ہو جاتا- خرچ کرتے وقت اور سبھی کچھ' اور ان کی ضرورتیں تو مجھے یاد رہتی تھیں' یہاں تک کہ بہن بھائیوں جیسے طالب علموں اور محکمہ کے کارکنوں کی ضرورتوں اور کمیوں کے بارہ میں سوچتے سوچتے کبھی کبھی میں پریشان بھی ہو جاتی تھی- اگر کچھ یاد نہ رہتا تھا تو مجھ کو اپنا آپ' اور اپنی ضرورتیں- تاہم "بڑھیا رائیٹنگ ٹیبل خریدنا ہے!" کسی وقت میرے مونہہ سے بیساختہ نکل گیا- ایک دوست بولا- "آپ کا خیال ہے بڑھیا ناول صرف بڑھیا رائیٹنگ ٹیبل پر ہی لکھے جاتے ہیں؟"

بھوپیندر سے بیاہ کر کے جب اپنا گھر بسا تو ایک روز منی پلانٹ کی بیل لٹکانے کے لئے میں دیوار میں کیل گاڑنے لگی- اسی وقت مالک مکان کی بیوی اوپر دوڑی آئی اور بولی- "اس طرح کیلیں گاڑ کر ہمارا مکان خراب مت کرو- ہم نے تو بڑی رقم خرچ کی ہے!" بات سن کر میرے ہاتھ کانپ کر رہ گئے-

"آدمی کا اپنا گھر ہونا چاہئے!" میں نے بھوپیندر سے کہا "ہندوستان میں لاکھوں کروڑوں لوگ ہیں جن کے اپنے گھر نہیں ہیں- آپ ان سے کس طرح افضل ہیں کہ آپ کو ضرور اپنا گھر چاہئے؟" بھوپیندر نے جواب دیا-

کرائے کا وہ مکان چھوڑ کر ہم دوسرے کرائے کے مکان میں اٹھ آئے- کرایہ بڑھانے کے لئے' کوئی سال بھر کے بعد مالک مکان کہہ دیتا ہے کہ مکان خالی کر دو- اس خالی کرائے جانے والے مکان میں ایک ڈرا ینگ روم ہے' ایک ڈائینگ روم' ایک بیڈ روم اور ایک بھوپیندر کا مطالعہ کا کمرہ جو ساتھ کے ساتھ گیسٹ روم بھی ہے- یوں تو یہ سارا گھر ہی میرا ہے' مگر میرا کمرہ یہاں کوئی نہیں ہے-

کچھ برس ہوئے' میں نے بے جی سے کہا---- "انسان کا اپنا گھر ہونا چاہئے!" انہوں نے کہا- "کوٹھی کے آگے جو باغیچہ پڑا ہے' اس میں بنا لو!"---- اور کسی نہ کسی طور اس باغیچہ میں مکان بھی بن گیا- اس مکان میں اک اپنا کمرہ

بنوایا جس میں بہت ساری کتابیں رکھنے کے لئے الماریاں ہیں' سنگ سپید کا فرش ہے' ساگوان کے دروازے ہیں' گول ڈاٹ کی کھڑکیاں ہیں جن کے پاس ہی گلاب کی بیل پر پیازی پھول کھلتے ہیں۔

لیکن اس مکان میں آج کل ملٹری کا ایک میجر رہتا ہے جو شائد کہتا ہو کہ احمق مکان بنواتے ہیں اور دانا اس میں بستے ہیں۔

پھر سوچا---- اتنا ہی کیا کافی نہیں ہے کہ دنیا میں ایک ملک ہے' اس ملک میں ایک شہر ہے' اس شہر میں ایک مکان ہے اور اس مکان میں ایک کمرہ ہے جو آپ کا ہے' اور آپ کا نہیں ہے.....

لیکن یہ سب باتیں تو اب پیچھے رہ گئی ہیں۔ دل اتنا صابر ہو گیا ہے' یا کون جانے لاتعلق ہو گیا ہے کہ اب تو میں کہیں بھی ڈرائنگ روم کے صوفہ پر' بیڈ روم کے پلنگ پر' صحن میں' لائبریری کے باہر کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر بھی پڑھ سکتی ہوں' لکھ سکتی ہوں۔ اب تو آس پاس کہیں ریڈیو بولتا ہو' لوگ باتیں کرتے ہوں' وہ بھی خلل انداز نہیں ہوتے۔ شائد اس لئے کہ ان لمحات میں جب میرا ہاتھ قلم تک پہنچتا ہے اور قلم تحریر تک---- اس پل نج کی سبھی ضرورتیں پیچھے رہ جاتیں' اور کمرے کی ضرورت بھی.....

چندن نیگی 1937

یادوں کے پچھلے تاروں کو ادھیڑتی ہوں تو ایک ہی کمرہ یاد آتا ہے جس میں میری ساجھے داری مشکل سے چار پانچ مہینے رہی تھی، مگر وہ کتنے ہی برس، چندن کا کمرہ، کہلاتا رہا۔ میری شادی کے بعد وہ کمرہ خالی ہو گیا۔ نسواری پایوں والی نواڑی پلنگ کسی کا بھی نہ رہا۔ سٹور سا بن گیا۔ خالی پلنگ، سپید میز پوشوں ڈھکے ٹرنک اور بڑی بڑی کھونٹیوں پر ٹنگے ہوئے کپڑے.....!

پشاور میں بڑا گھر تھا۔ کمرے ہی کمرے۔ تین منزلوں میں کون سا کس کا کمرہ؟ ہاں، ایک پلنگ تھا بیٹھک میں جہاں صوفے اور سرخ قالین بچھے تھے۔ اس پلنگ پر کوئی نہیں سوتا تھا۔ میرا اس پلنگ پر سونے کو جی کرتا تھا۔ جب ماں اور پپا گھر پر نہیں ہوتے تھے تب میں اس پلنگ پر بیٹھتی اور میرا چھوٹا بھائی لڑائی ہو جانے پر ہمیشہ رعب جھاڑتا، "ماں سے کہہ دوں گا کہ تم بیٹھک کے پلنگ پر بیٹھی بھی تھیں اور سوئی بھی تھیں....." اور میں ہار مان لیتی تھی۔

پھر پشاور سے جموں آ گئے تھے۔ کتنے ہی نئے اور اجنبی لفظ سن سن کر حیران ہوتی تھی---- رفیوجی، پناہ گزیں، شرنارتھی---- بڑی عجیب لگتی تھیں پتھروں کی گلیاں، پتھروں کے بازار، ٹیکے، بلندیاں، پستیاں، توی دریا پر نہانا۔ کمرہ تو بڑی ڈھونڈ اور بھاگ دوڑ سے ایک ملا تھا۔ لوگوں کے بڑے بڑے مکان خالی پڑے تھے، مگر کرائے پر دینے کا رواج نہیں تھا۔ کیسے لوگ ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟---- بڑی سفارشوں سے ایک کمرہ ملا تھا، دو چار مہینے رہنے کے لئے۔ وہیں سب سوتے تھے۔ وہیں کھانا بنتا تھا۔ میں گورمت کنیا پاٹھ شالا جانے لگی تھی۔ ایک طاقچے میں

کتابیں ٹھونس ٹھونس کر رکھ دیتی تھی۔ چہار اطراف دہشت سی تھی۔ ریڈیو پر سارے خبریں سنتے رہتے۔۔۔۔ پھر وہ سارا مکان جیسے ہمارا ہو گیا ہو اور ہم بھی اس خاندان کا حصہ! اور خالی کمرے بھی ہمیں مل گئے۔ اس مکان میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کی کھڑکیوں میں لال' پیلے' نیلے اور سبز شیشے جڑے تھے۔ یہ کھڑکیاں بازار کی سمت میں کھلتی تھیں۔ میں اور مالک مکان کی لڑکی اسی کمرے میں سوتی تھیں۔ اس کمرے میں ہلکی ہلکی' رنگ برنگی دھوپ کے ٹکڑے مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ اپنی کتاب یا کاپی میں ان دھوپ کے ٹکڑوں سے رنگ کر کے سبق یاد کرتی تھی۔

میں بہت کم سن تھی اور مالک مکان کی بیٹی بھرپور جوان! میں چھوٹے سے جمورے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ لگی رہتی تھی۔ اسی کمرے میں جب اس کو ٹیچر پڑھانے آتا تھا تو مجھے کیوں اندر بیٹھنے کے لئے کہتے تھے' میں سمجھ نہیں پاتی تھی۔

میٹرک تک سہیلیوں کے ٹفلٹے' کانا باتی' چاٹ' املی' کچی امیاں کھا کھا کر خرمستیاں۔۔۔ مگر پھر ہم پٹیالہ چلے گئے۔ پانچ سال بعد جب جموں گئی تو دیکھا اس کمرے کی چھت ٹوٹ چکی تھی' رنگ برنگے شیشوں میں دراڑیں آ گئی تھیں اور کہیں کہیں سے پلستر بھی اکھڑ گیا تھا۔ یہاں میرے بچپن اور مالک مکان کی بیٹی کی جوانی کے ساتھ جڑا ہوا سب کچھ مٹ چکا تھا۔

جموں سے پپا جی کی تبدیلی پٹیالہ ہو گئی تھی۔ دھرم پورا بازار میں اونچے چبوترے والا مکان۔ مکان کی پوری چوڑائی جتنا لمبا چبوترہ اور چبوترے پر ہی بیٹھک پشاور کے بعد یہ اپنا مکان جسے ماں رگڑ رگڑ کر دھوتی بھی تھیں اور دھلواتی بھی تھیں۔ یہ مکان ارد گرد کی دونوں گلیوں کو الگ لگ کرتے ہوئے کھمبے کی طرح کھڑا لگتا تھا۔ دونوں گلیوں کی ساجھے داری کے لئے ایک دروازہ آنگن میں اور دوسری گلی کا دوسرا دروازہ میرے کمرے میں!۔۔۔۔ میرے ساتھ اس کمرے کا اشتراک کچھ مہینے ہی رہا تھا مگر برسوں تک یہ بھی "چندن کا کمرہ" ہی بنا رہا۔ برسوں تک میں اپنا وجود اس گھر میں محسوس کرتی رہی۔ پرائے گھر جا کر بھی جب میں کچھ دنوں کے لئے واپس اس گھر میں آتی تھی' ماں کے گھر' پپا جی کے گھر یا جو صرف میرا گھر تھا'

تو "میرا کمرہ" ہمیشہ میرا انتظار کرتا تھا۔ ہر عورت کے ماں باپ کا گھر یہ اس کا اپنا گھر ہوتا ہے۔ کئی مردوں کو بڑھاپے میں بھی عورتوں سے کہتے سنا ہے "جا اپنے گھر.....! سو اپنا گھر اس کا وہی ہوا جہاں وہ پیدا ہوئی تھی، پلی بڑھی تھی..... اس کمرے کی دونوں دیواروں میں سرخ دروازے گلی میں کھلتے تھے۔ آگے ٹرکوں کی قطار ہوتی۔ دھوپ کی کچھ لکیریں دراڑوں میں سے ہو کر کمرے میں آ جاتی تھیں۔ یا بجلی کی روشنی کی لمبی کرنیں باہر گلی میں بچھ جاتی تھیں۔ یہ دروازہ کبھی نہیں کھلا تھا، کسی نے کبھی اس کی دہلیز پار نہیں کی تھی۔ بازار والی دیوار میں لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی تھی۔ اور چبوترے کے پاس لگے بجلی کے کھمبے سے لٹکی ہوئی ٹیوب کی روشنی رات بھر میرے کمرے میں لوہے کی سلاخوں کی پرچھائیاں میرے اوپر بچھائے رکھتی تھی، پھر سامنی دیوار پر..... اور پھر یہ پرچھائیاں چھت کے شہتیروں میں غائب ہو جاتی تھیں۔

دسویں کے نتیجے اور بیاہ میں تین چار ماہ کا وقفہ تھا، اس لئے کیانی کی تیاری کرنے لگی۔ انہی دنوں ناولوں کا ایسا شوق پڑا کہ آدھی آدھی رات تک اسی ٹیوب کی روشنی میں ناول ختم کر کے سوتی۔ کاشمیری کشیدہ کاری والی میز پر بے ترتیب پڑی ہوئی میری کتابیں، کچھ بند، کچھ ادھ کھلی، اور میں پسر کر دیر تک سوتی رہتی تھی یا مکر کر کے لیٹی رہتی تھی۔ گھڑی کے بغیر ہی اس کمرے میں ساری رات وقت کا اندازہ رہتا تھا۔ ساڑھے بارہ سے ایک بجے تک سینما سے لوٹنے والوں کا شور، مباحث، کون گاتا اچھا ہے، کس کی اداکاری عمدہ ہے!---- ٹھیک اڑھائی بجے ایک بزرگ سائیکل پر ثمنی صاحب کا پاٹھ کرتے گزرا کرتے۔ ان کے پیچھے پیچھے ہی ایک اور بجن تیز تیز قدموں سے ننگے پاؤں میرے کمرے کے پاس سے "سودر" کی پوڑی پڑھتے ہوئے نکلتے۔ ایک گھنٹہ بعد چوکیدار کے لٹھ کی آواز گونجتی۔ اور پھر عورتوں، مردوں، لڑکیوں و لڑکوں کی گوردوارہ دکھ نوارن جانے کی دوڑ بھاگ شروع ہو جاتی تھی۔ نوراتروں میں دیوی کے بھگتوں کی ڈلیاں بھینٹ گاتی کالی دیوی کے مندر کو آدھی رات سے ہی جانا شروع ہو جاتیں تھیں۔

بیاہ کے بعد بھی میں اسی کمرے میں سامان رکھتی اور اسی میں سوتی تھی۔ نجانے اس چھوٹے سے کمرے سے مجھے کیوں انس تھا؟ ہاتھ پاؤں میں مہندی بھی اسی کمرے میں لگائی گئی تھی۔ ماموں جان نے چوڑا بھی اسی کمرے میں میری بانہوں میں چڑھایا۔۔۔۔ "رو نہیں، بچی! بول واہگورو!" اور وہ خود رو پڑے تھے۔

پچھلے دنوں پٹیالہ گئی تھی۔ رکشا سے اترتے ہی دیکھا، میرے کمرے کی سرخ سلاخوں والی کھڑکی پورے چوکھٹے سمیت دیوار کے ساتھ سہارا لگائے کھڑی ہے۔ نہ وہاں چبوترہ ہے، نہ زینہ، نہ کھڑکیاں۔ گھور کر دیکھا تو چندن کا کمرہ،..... مجھے لگا، اس گھر سے میرا وجود ہی مٹ گیا ہے۔ چندن کے کمرے کے ساتھ چندن کی یاد بھی جیسے سب کے دلوں سے اٹھ گئی ہو۔ وہاں تو دوکانیں بن گئی تھیں۔ کمرے تو پچھلے صحن میں چلے گئے تھے یا اوپر کے چوباروں اور دوکانوں پر بن گئے تھے جہاں اب کوئی بھی "چندن کے کمرے" کا نام نہیں لیتا تھا۔ کتنی ہی دیر تک اس دوکان کے باہر مبہوت سی کھڑی رہی تھی۔ کتنی ہی دیر تک اس دوکان کے اندر بیٹھ کر دیواروں کو تاکتی رہی تھی۔ سب کچھ غیر غیر سا تھا۔۔۔۔ چھت تک شیلف، اور شیلفوں میں جوتے، سینڈلیں اور چپلیں۔ نئی دیواریں، نئی چھت۔۔۔۔ اور ٹوٹا ٹوٹا میرا خود.....

اس کمرے کے بعد کبھی بھی کوئی کمرہ میرا نہیں ہوا۔ عورت کا بھی کبھی کمرہ ہوتا ہے؟..... عورت کا بھی کبھی گھر ہوتا ہے؟..... گھر تو ہمارا گھر، ہوتا ہے، خاوند بیوی کا۔ اور کمرہ بھی "ہمارا بیڈ روم" ہوتا ہے۔ سو ہمارا گھر اور ہمارا بیڈ روم جس جی کے ٹرانسفروں کے باعث بدلتے رہے، ایک سے دوسرے شہر۔ کہیں ہمارا کمرہ بڑا تو کہیں چھوٹا۔ کہیں پھولوں کی کیاریوں سے گھرا ہوا تو کہیں سڑک کے کنارے۔ اب خالی ویران کھڈوں اور گڑھوں سے گھرا گھرا چوتھی منزل پر ہمارا بیڈ روم ہے۔

جس عمر میں پہلا "ہمارا کمرہ" بنا تھا، تب ابھی جوانی میں قدم رکھا ہی تھا۔ بیاہ؟..... ساتھی؟..... پیار؟..... بندھن؟..... کچھ ہوش نہیں تھا۔ دہلی میں قرول باغ ویسٹرن ایکسٹینشن کی کوٹھی میں "ہمارا بیڈ روم" تھا۔ پھولوں، کلیوں، گلدستوں سے آراستہ، جہاں سچ مچ محبت کے سپنوں نے حقیقت کی شکل اختیار کی

تھی- دنیا و مافیہا سے بے خبر وہاں ہم دونوں ہی ہوتے تھے' سب بھول بھلا کر!

تبدیلیوں کے چکر میں ایک سے دوسرے شہر ہوتے ہوئے ہم پھر جموں پہنچ گئے- شہر کی بڑی سڑک کے کنارے "ہمارا گھر" اور سڑک پر کھلنے والی "ہمارے بیڈ روم" کی بڑی بڑی کھڑکیاں' جن میں سے ایک چوک سے لے کر دوسرے چوک تک پوری سڑک دکھائی دیتی تھی- اسی گھر کی اندر والی گلی سے ہی کتنے کردار ملے- کتنا روئی تھی میں اس مکان کے دروازے پر تالہ لگاتے وقت! اس مکان کی اک اک اینٹ سے میں نے پیار کیا تھا- پورے سولہ سال اس گھر میں بتائے تھے- اور سولہ سال کی ساجھے داری توڑتے ہوئے میرے تن من کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے- مگر سرکاری نوکری..... پھر دہلی آنے پر ایسا لگتا تھا گویا کوئی نو عروس دلہن پہلی بار اپنی سسرال آئی ہو- اکھڑی اکھڑی' بیگانہ بیگانہ..... اور شب و روز کاٹے جا رہی ہو' اپنے گھر لوٹنے کے لئے-

جموں سے میری' میرے گھر' والی ساجھے داری ہے- جموں کی بلندیوں اور پستیوں پر چڑھنے اترنے کی عادت تھی- سپاٹ' پھیلی ہوئی سڑک پر اب چلنے سے تھک جاتی ہوں- جموں کی سرد ہوا' توی کا میٹھا پانی اور ڈوگری بولی میرے بال بال میں سمائی ہوئی ہے- کسی نہ کسی بہانے سے میں جموں جاتی رہتی ہوں- اب کے جموں گئی تو قدم آپ سے آپ ان سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے جن پر ایک سانس میں چڑھ جایا کرتی تھی- دروازے کے پاس وہی میں تھی ں دبانے کی ضرورت نہیں پڑی- دروازہ چوپٹ کھلا تھا- میرے دل میں ہول اٹھا گویا مجھ سے ہی بھول کر وہ کھلا رہ گیا ہو او اندر کا سب کچھ لوٹ پاٹ لیا گیا ہو- صحن خالی' رسوئی میں ایک ہی چولہا---- میں گھبرائی ،ں سی ڈرائینگ روم کی طرف بڑھی- ہوش لوٹی---- وہ تو اب "ہمارا گھر" نہیں ہے- دیوار سے لگا ہوا دیوان جہاں میں گاؤ تکیہ لگائے افسانے اور ریڈیو ڈرامے لکھا کرتی تھی- اس کی جگہ ایک کرسی پڑی ہے- اس پر ایک ڈاکٹر بیٹھا ہے- سامنے میز پر سٹیتھسکوپ' بلڈ پریشر آپریٹس ،ر کتنا ہی الم غلم' دوائیاں اور کیپسول کی شیشیاں..... پڑی ہیں- صوفے کی جگہ بنچوں پر

تین چار مریض بیٹھے تھے۔ میں باہر صحن کی طرف سے دوسرے کمرے میں سے ہو کے "اپنے بیڈ روم" میں گئی' "ہمارے کمرے" میں! کبھی اس کمرے سے سامان اٹھواتے وقت میں ڈھاڑیں مار کر روئی تھی۔ وہ کمرہ.....؟ وہ عجیب کہانیوں سے بھرا پڑا ہے۔ وہاں پاگل' سنکی' سر پھرے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر بٹھایا ہوا ہے۔ کوئی خاموش ہے' کوئی اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے' کوئی گھور گھور کر دیکھ رہا ہے کوئی رو رہا ہے' کوئی ہنس رہا ہے---- خیر' روز کتنی ہی کہانیاں سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر ادھ مری سی ہو کر دیواروں سے چپٹ جاتی ہیں۔ اور مجھے وہاں کھڑے لگ رہا تھا جیسے میں بھی آدھی پاگل سی ہو گئی ہوں۔ دیواروں سے لپٹ جانے کو جی کرتا تھا' پیٹھ سٹا کر کھڑے ہونے کو جی کرتا تھا'---- کتنا انس ہو جاتا ہے اینٹوں' دیواروں' فرشوں سے.....!

جموں کے "ہمارے گھر" کے "ہمارے کمرے" سے دہلی آنے پر "ہمارے گھر" کے "ہمارے کمرے" میں دل بڑا اچٹتا تھا۔ کتنی ہی دیر اپنے ساتھ روٹھی رہی تھی' کتنی ہی دیر قلم نظر انداز ہوئی رہی۔ ہر وقت جھلائی جھلائی سی رہتی کہ دوڑ کر وہاں چہل پہل والے گھر چلی جاؤں جہاں دن رات پلوں میں بیت جاتے تھے۔ یہاں تو وقت جیسے رینگتا ہوا چلتا ہو یا دیواروں سے چمٹ کر ساکت ہو گیا ہو۔

مجھے "میرا کمرہ" کی آج تک تمنا نہ رہی تھی۔ اب جس وقت کچھ لکھنے کو جی کرتا ہے تو سوچتی ہوں---- ایک "چیرا کمرہ" ہو۔ صرف میرا' جہاں قلم اور کاغذ کی صحبت میں رہتے کوئی بلائے نہیں' کوئی اٹھائے نہیں۔ گھر میں اب بھی کوئی شور شرابہ نہیں ہے' کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ پھر گھر "ہمارا" ہے۔ "ہمارے گھر" میں کبھی کوئی آ جاتا ہے' انداز تحریر میں موزونیت نہیں آتی۔ گرہستی ہے---- سو اس کو نبھانا اولیں فرض! ہاتھ کا کام نپٹا کر کہانی لکھنے کا سوچتی ہوں' لیکن میز خالی پڑی رہتی ہے' ٹیبل لیمپ جلتا رہتا ہے اور میں اپنے کونے میں آ بیٹھتی ہوں۔ بڑی تسلی ہے کہ "ہمارے گھر" میں ایک کونہ میرا ہے۔ "ہمارے پلنگ" پر میرے سرہانے والا کونہ---- میں کلپ بورڈ گھٹنوں پر رکھ کر' تین چار تکیوں کا سہارا

لے کر لکھنے لگتی ہوں۔ جب جس جی ڈیوٹی پر ہوں---- خواہ صبح چار بجے' خواہ رات کو گیارہ بجے---- میں اسی کونے میں بیٹھ کر لکھتی ہوں۔ میری پشت کی طرف آئینوں والی کھڑکی میں سے دور تک اونچے نیچے ٹیلے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی کوئی چمکتا ہوا پرندہ بھی اڑتا ہوا نکلتا ہے یا کبھی ہوائی جہاز کی گونج ہی سنائی دے جاتی ہے۔ سارے گھر میں یہی ایک کونہ میرا اپنا ہے جہاں بکھرے ہوئے کاغذوں کو سمجھالتی ہوں۔ تکئے کے نیچے دبی ہوئی کاغذوں کی لکھی' ان لکھی گٹھیوں کو کبھی کھول کر دیکھتی ہوں۔ گدے کے نیچے دبکی ہوئی چٹھیاں وہاں سارے گھر سے زیادہ محفوظ رہتی ہیں۔ کئی بار ٹیلی ویژن کی آواز سے چڑ اٹھتی ہوں' انگریزی دھنیں سن رہی بچی کے ٹیپ ادھر ادھر رکھ دیتی ہوں۔ مگر پھر سوچتی ہوں' یہی گھر تو اس کا اپنا ہے' پرائے گھر جا کر تو وہ بھی "ہمارے گھر" کے تانے بانے میں الجھ کر رہ جائے گی میں برآمدے میں بیٹھوں خواہ بیٹھک میں بچوں کے کمرے میں یا کہیں اور' کہانی ختم ہو جاتی ہے' بنتی نہیں۔ "میرا کمرہ" کبھی سوچتی ہوں' مگر نہیں' جہاں بھی "ہمارا کمرہ" ہو---- سوچتی ہوں' اس میں چاروں طرف چھت تک کتابوں کی الماریاں ہوں' میں ہوؤں' میرے کاغذ ہوں' میرا جسی' میری کہانیاں' رسالے' میگزینوں کے تھیے' اور' اور---- کتابیں ہی کتابیں.....

اب مجھے اپنے کونے کے پاس کی کھڑکی سے پیچھے کی طرف دکھنے والی ویرانی اچھی لگنے لگی ہے۔ دور سے موروں کی کوک سنائی دیتی ہے۔ شام کو جب کھڈوں کھائیوں سے دور پرے سورج سیندوری رنگ سے رنگا جاتا ہے اور شفاف' نیلے آسمان کی سطح پر سنہری رنگ بچھ جاتا ہے' میں سارا کام چھوڑ کر گم ہو رہے سورج کو دیکھتی رہتی ہوں جب تک کہ وہ افق کی گود میں سما نہیں جاتا۔ سوچتی ہوں' صبح پھر آسمان کی کوکھ سے پیدا ہو کر' "ہمارے کمرے" کی دوسری کھڑکی میں سے اندر جھانکے گا۔ امید زندہ رکھتی ہے۔ ایک امید ہے کہ چنڈی گڑھ کے "ہمارے گھر" میں اک کمرہ بنے گا جس میں پنجابی' اردو' انگریزی' ڈوگری' روسی ادیب اپنی اپنی تصانیف کی وساطت سے مل بیٹھیں گے!

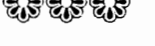

کرشن اشانت 1938

میرے تصور میں ہمیشہ ایک ایسا کمرہ ابھرتا ہے جو کلیتہ" میرا ہو' تاہم اس کا خاکہ بنانا بہت دشوار لگتا ہے- وجہ یہ کہ اس کمرے کی دیواریں' فرش' کھڑکیاں' روشن دان' فرنیچر' بتیاں---- صرف میرے تصور کی کوکھ سے ہی نہیں پیدا ہوئے- بلکہ اب تک کے بہت سے کمروں' گھروں' ہوٹلوں' سراؤں' ہوسٹلوں میں رہتے وقت کہیں نہ کہیں میرے آدرش کمرے کا کوئی نہ کوئی جزو نظر آیا ہے جس سے میری دلچسپی نے لگاؤ کی شکل اختیار کر لی ہے- اس الگ الگ طرح کے لگاؤ کی بوقلمی میں سے میرے آدرش کمرے کا جو خاکہ بنتا ہے' وہ اس طرح ہے----

سائز---- ۱۵x۱۵ فٹ

دیواریں---- موٹی' مٹیالے رنگ کی جن میں جہاں جی چاہے' کیل ٹھونکی جا سکے اور ساتھ میں پانچ چھ بڑے بڑے طاقچے ہوں-

چھت---- سپید رنگ کی جو زیادہ اونچی ہو-

کھڑکیاں---- باریک جالی والی' لوہے کی موٹی سلاخیں' لڑکی کے کواڑ ہوں جن کے بند ہونے پر باہر سے کچھ بھی نظر نہ آئے-

دروازے---- مضبوط لکڑی کے' بنا پالش' جو بند ہونے پر باہر کے شور و غل کو کاملا" روک لیں-

فرش---- ہلکے بھورے رنگ کا-

فرنیچر---- فرش پر بچھا ہوا روئی کا موٹا گدا ہو اور اس کے اوپر شوخ رنگ برنگ چادر جس کے چاروں طرف کا بڑھا ہوا حصہ گدے کے نیچے دبا ہو- چار

سیدھی پشت والی، چمڑے کی سیٹ والی کرسیاں، چھوٹے سائز کی دو میزیں۔ میز اور کرسیاں بغیر کسی ترتیب کے بکھری ہوئی ہوں، گدے پر چاروں طرف (کرسیو ں) پر میزوں پر، بے ترتیب پڑی ہوئی کتابیں۔

دیگر سازو سامان۔۔۔۔ گدے کے پاس چائے بنانے کی برقی کیتلی، باقی جگہوں پر ردی کاغذ، خالی ڈبیاں اور سگرٹوں کے ٹوٹے.....

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بہت کم لوگوں کو اپنے پہننے کے کپڑوں کے صحیح استعمال کا سلیقہ ہوتا ہے۔ بوریاں آلو، پیاز، ریت وغیرہ بھرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ جو لوگ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ خوبصورتی سے تہہ کی ہوئی نئی بوریاں چنے یا شکر قندی بھرنے سے بدصورت ہو جائیں گی، وہ اتنی ہی غلط فہمی میں مبتلا ہیں جتنا کپڑے خراب ہونے کے ڈر سے جی چاہتے ہوئے بھی گھاس پر نہ بیٹھنا یا جیبوں میں مونگ پھلی یا ریوڑیاں نہ ڈالنا۔ اپنے کمرے کے بارہ میں بھی میرا جیبوں میں مونگ پھلی بھرنے والا ہی رویہ ہے۔

اسی سلسلے میں مجھے بمبئی کے ایک شناسا شاعر کی یاد آگئی ہے۔ ایک آدرش کمرے یا سٹڈی روم کے بارہ میں اس کا خاص قسم کا نظریہ ہے۔ ایک بار ایک پروڈیوسر نے اس کو فلم کے ڈائیلاگ لکھنے کے لئے کافی رقم دی اور ایک فائیو سٹار ہوٹل میں ایک مہینے کے لئے ایک آراستہ کمرہ بھی بک کروا دیا۔ اس بھلے مانس نے پچیس دن اس ہوٹل میں رہ کر سارے پیسوں کی شراب پی ڈالی اور ایک بھی ڈائیلاگ نہ لکھ سکا۔ چھبیسویں دن اس نے ہوٹل کے منیجر سے مہینے کے باقی دنوں کا کرایہ واپس لے لیا اور ایک مزدور بستی میں بیس روپیہ ماہانہ پر ایک گھاس کی چھت والا کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ جس میں ایک بان کی کھاٹ اور پانی کی صراحی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر بیٹھ کے اس نے سارے ڈائیلاگ لکھ مارے۔ ڈائیلاگ کمال کے تھے اور فلم ہٹ ہو گئی۔ شائد یہ کامیابی اس کمرے کی بدولت تھی جس میں بیٹھ کر اس کو وہ "اپنا کمرہ" لگتا رہا تھا۔ بعد میں وہ ہوٹل کے ذکر چھڑنے پر ہمیشہ کہتا: "ابے یار! وہ ہوٹل والا خاک کمرہ تھا۔ مجھے تو وہ آپریشن تھیٹر

ہی لگتا رہا۔"

میں نے دو بار آپریشن تھیٹر دیکھے ہیں---- صاف' اپنی مخصوص بو لئے ہوئے۔ ہر شے اپنی جگہ پر رکھی ہوئی۔ اور اس میں داخل ہوتے ہی ایسا لگتا ہے جیسے میرے داخل ہونے سے وہ کچھ میلا ہو گیا ہے یا مجھے اپنا آپ میلا لگنے لگتا ہے۔ کچھ لوگوں کے نجی کمرے بھی مجھ پر کچھ اسی طرح کا ہی احساس پیدا کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے' یہ میرے اندر کے کسی احساس کمتری کی وجہ سے ہو۔ ایسے کمرے دیکھ کر مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا' میں اپنے سگریٹ کا دھواں' اپنے پیر' ہاتھ' دھڑ کو کہاں رکھوں۔ کافی خالی جگہ ہوتے ہوئے بھی کمرے کا پورا ماحول کسی مہک' صفائی یا ترتیب سے پورے کا پورا بھرا پڑا ہوتا ہے۔ ہر بار یوں لگتا ہے گویا سانس یا آواز بھی اس کمرے کی فضا میں ارتعاش پیدا کر دے گی۔

میرا کمرا" اصل یہ ہے کہ میرا "اپنا کمرہ" کوئی نہیں ہے۔ میں آج تک دو سے زیادہ کمروں والے مکان میں نہیں رہا ہوں۔ دونوں کمروں میں سے ایک کو بیگم ڈرا ینگ روم بنا رکھتی ہیں۔ ڈرا ینگ روم' گیسٹ روم' ڈائینگ روم' سٹڈی روم' نرسری روم---- کچھ بھی کہہ لیجئے---- اس میں میری مالی حالت کے مطابق سامان گھٹتا بڑھتا رہتا ہے مگر لکڑی کا ایک تخت سدا رہا ہے۔ کوئی مہمان آ جاتا ہے تو یہ سونے کے کام آ جاتا ہے۔ میں گھر میں سدا اس تخت پر بیٹھتا ہوں۔ کئی بار اس تخت پر کچھ لکھنے یا پڑھنے کے لئے بیٹھنے سے قبل بچوں کی میلی جرابیں' کنگھی' یا چپل کے ایک پیر کو اٹھا کر دوسرے کمرے میں پھینکنا پڑتا ہے۔

سو گھر میں میں جس کمرے میں "اپنا" کچھ ہونے کا حق سمجھتا ہوں' وہ ہمیشہ میرے گھر کا ڈرا ینگ روم نام کا کمرہ رہا ہے۔

گزشتہ کچھ سالوں سے میں نے اک نیا تعمیر شدہ مکان کرایہ پر لیا ہوا ہے جو پہلی منزل پر ہے۔ ۳۵ر۲۱ ویسٹ پٹیل نگر' دلی میں! اس کا جو کمرہ ڈرا ینگ روم بنایا گیا ہے' وہ چودہx بارہ فٹ سائز کا ہے۔ اس کی مشرقی دیوار کے ساتھ میرا دیوان لگا ہوا ہے' تین فٹ چوڑے اور چھ فٹ لمبے سائز کا۔ اس پر روئی کا گدا بچھا کر کدبانو

ہمیشہ بیل بوٹوں والی چادر بچھائے رکھتی ہیں۔ اسی دیوار پر تخت سے قریب دو فٹ اوپر سے شروع ہو کر ۴x۴ فٹ کا ایک شوکیس ہوے جس کے اوپر کے مختلف سائزوں کے خانوں میں کتابیں' میرے دونو بچوں---- سمیر اور رچی---- کیپ اک فریم دار فوٹو' میری بیوی کمل کی ایک فوٹو اور دو یکساں سائز کی ڈھولک بجاتے مرد اور عورت کی سیاہ مٹی کی مورتیاں ہیں۔ سب سے نچلے خانے کا شیشہ ایسا ہے جس میں سے نظر نہیں آ سکتا۔ اس میں میرے پن' پرانے خطوط' اور ادھر ادھر کی چیزیں رکھی رہتی ہیں۔

مغربی دیوار ساری کی ساری شیشے کے سرکنے والے دروازے کی ہے۔ شام کے وقت سامنے' اُونچی پہاڑی سی پر بسی ہوئی بلجیت نگر کی بستی کے اونچے نیچے مکانوں کی بتیوں سے کسی پہاڑی قصبے کا گمان ہوتا ہے۔ ان شیشوں کی دیوار کی طرف پردے لگے ہوئے ہیں جن سے شیشے کے دروازوں کو پوری طرح ڈھکا جا سکتا ہے۔ اس دیوار کے آگے ایک بالکونی ہے' کوئی چار' چارپائیوں کی گنجائش والی۔

جنوبی دیوار پر ایک واٹر کلر کی ۲x۴ فٹ کی پینٹنگ ہے---- چار عورتوں کی جو رقص کے انداز میں کھڑی ہیں۔ شمالی دیوار میں چھ فٹ لمبائی او چار فٹ چوڑائی والی کھڑکیاں ہیں---- جالی اور آئینوں کے کواڑوں والی۔ ان پر بھی پورا پردہ لگا ہے۔ یہ کھڑکیاں پوری طرح نہیں کھل سکتیں کیونکہ اس طرف لکڑی کا ایک شوکیس ہے۔ یہ تین فٹ اونچا اور پانچ فٹ لمبا ہے۔ اس کے دو آئینوں کے سرکنے والے ڈبل سائز کے خانوں میں کتابیں ہیں' اور نیچے لکڑی کے طاقچوں والے خانے میں پیالے' پلیٹیں' دواؤں کی شیشیاں' خالی یا نصف بھری ہوئی کوئی بوتل' برقی سوچ' کوئی کھوئی ہوئی کتاب' کیلیں' پالش کی ڈبیاں' بجلی کا تار وغیرہ بہت کچھ ہے۔ کئی بار اس خانے کی چیزوں میں ہتھوڑی ڈھونڈتے ڈھونڈتے کوئی مدتوں کا کھویا ہوا پن اچانک مل جاتا ہے۔ اس شوکیس کے عقب میں کھڑکی کے نیچے سمینٹ کا ریک ہے جو کتابوں سے بھرا رہتا ہے۔ اس چوبی شوکیس کے ساتھ ہی مشرق کی طرف ایک اور شیشے کی کھڑکیوں والا بک ریک ہے جس میں صرف جوتش

کی کتابیں ہیں اور کچھ رسالے۔ اس ریک پر ٹیلی ویژن رکھا ہوا ہے۔ ٹیلی ویژن سے ایک فٹ اوپر دیو کی محبت سی دی ہوئی ایک پینٹنگ ہے جو بقول دیو عوامی پیشاب گاہوں کے فن پاروں' کی طرف پر بنی ہوئی ہے۔ طرز کی بات سن کر کئی ملنے والے اس کو اتنا قریب ہو کر دیکھے ہیں جیسے دیکھنے کے بجائے سونگھتے ہوں۔ اسی دیوار کے مغرب کی جانب ایک پرانی میز ہے جسے آگے کی طرف سے پاؤں تک کپڑے سے ڈھانپ رکھا ہے اور اس کے پیچھے ردی میں بیچنے والے اخباروں و رسائل کا انبار ہوتا ہے جو سرسری نظر سے دکھائی نہیں دیتا۔ میز کے دو فٹ اوپر دیوار پر کیلنڈر آویزاں ہے جو ہر سال بدل جاتا ہے اور سکیفو انڈیا ہیئرنگ کمپنی کا ہوتا ہے۔

بیگم اس بیچ والے بڑے شوکیس کے شیشوں کو چمکا کر رکھنے کی پوری کوشش کیا کرتی ہیں مگر بچے اس سے بھی زیادہ سنجیدہ باقاعدگی سے ان شیشوں پر ٹوتھ پیسٹ' بلیڈ وغیرہ کی پبلسٹی کے پوسٹر' محمد علی باکسر کی فوٹو' ہیما مالنی' دارا سنگھ یا ہنومان کی تصویریں لئی یا گوند سے چپکاتے رہتے ہیں۔

کمرے میں مغربی دیوار پر ٹیوب لائٹ ہے اور شمالی اور جنوبی دیواروں پر سنہری ٹوپیوں والا ایک خوبصورت گول برقی لیمپ ہے۔

فرش پر نرم سن کا ٹاٹ ایسا قالین ہے اور اس پر ۲x۴ فٹ چوڑی بھاری اور موٹی لکڑی کی میز ہے۔ اس پر سن مائیکا منڈھا ہوا ہوے۔ جنوب کی طرف صوفہ ہے اور مغرب کی جانب دو کرسیاں۔ صوفہ اور کرسیوں پر چمڑے جیسا فوم لیدر لگا ہوا ہے۔

کچھ سال قبل کہ بانو ایک پرانا روم کولر خرید لائی تھیں۔ اس کو سٹینڈ سے ہٹا کر صوفے کے برابر رکھا ہوا ہے۔ اسے بھی رنگین کپڑے سے ڈھانپا ہوا ہے اور وہ لکڑی کی ایک چھوٹی کی پیٹی ہونے کا بھلاوا دیتا ہے۔ اس پر نئے پرانے میگزین پڑے رہتے ہیں۔ صرف گرمیوں کے تین مہینے اس روم کولر کا چوغہ اتار کر اسے برہنہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

شائد اپنے آدرش کمرے کے بارہ میں لکھنا بھی اپنے اندر کے انسان کو عریاں کرنے جیسی ہی ایک بات ہے۔ لیکن برہنہ یا عریاں ہونے میں ندامت یا تفخر کی کوئی بات نہیں ہے۔ عریانی تو ایک حقیقت ہے---- خواہ وہ تلخ ہو، نمکین ہو یا شیریں ہو۔

ہو سکتا ہے، کبھی "میرے کمرے" کا تصور حقیقت بن جائے۔ اس بات کا امکان ضرور ہے۔ چلو، خواب آگیں امکانات آدمی کو خوش فہمی کی طلسمی دنیا میں اس کی انگلی تھام کر چلائے تو جا رہے ہیں---- یہی بہت ہے!

موہن جیت 1938

میرا نہیں، صرف کمرہ---- اپنے کمرے کا تصور کر کے آتش بازی کے انار کی طرح چلنے کا اندازہ ہوتا ہے۔ میرا بنانے کی خاطر ہی اندھیری غاروں جیسی ان دیواروں کی سلن میں کتنی ہی بار انگلیاں جلا کر روشنی کی کوشش کی ہے۔ ادھوری جون کی نظموں سے پوری کرنے کا بھرم بنتا رہا ہوں۔ میری تو صرف میری گھٹن ہے اور کمرہ سدا بیگانہ---- پھر بھی آج جو کچھ بھی ہوں، ان بیجان دیواروں کی بیگانگی کے اندر کی اپنائیت کی وجہ سے ہی تو ہوں---- نہیں، میرے بیجان دوستو! (آپ کبھی بھی بیگانہ نہیں تھے۔ اگر ہوتے تو مجھے ٹھٹھرتے لمحوں میں کبھی بھی دھوں دھوں کر جلنے نہ دیتے۔ بیگانہ کہنے سے ہی بھلا کوئی غیر ہو جاتا ہے؟ نہیں، میرے راز دانو! میں ہی جذباتی ہو جاتا ہوں) خیر! اس بیگانگی کو خواب ہوں تو یہ کمرہ کچھ ایسا تھا، یا ہے۔

تب مشکل سے پر نکلنے ہی شروع ہوئے تھے۔ چلچلاتی دھوپ میں ہم گھروں کی چھتوں پر کھاٹیں کھڑی کر کے ان پر کھیس تان کر "بنگلے" بناتے۔ اپنے ماں باپ کے روز کے اعمال کی نقل کرتے۔ کوئی لڑکا، "گھر والا" بن کر باہر کھیتوں کو جانے کا سوانگ کرتا۔ کوئی لڑکی دایہ بن کر دوسری لڑکی کا پیٹ ملتی۔ لاشعور کے یہ کھیل مشترکہ کمروں کی دین تھے۔ چھتیں ہی "اپنے" کمرے تھے جہاں ہم بے دھڑک ہو کر ننگے کھیل کھیلا کرتے تھے۔

گاؤں عدلی والا سارے کنبہ کا ایک ہی کمرہ۔ آگے صحن میں رسوئی۔ صحن میں ہی ایک کونے میں کھاٹ کھڑی کر کے ماں بہن نہا لیتی تھی۔ یہی کمرہ تھا جہاں

ماں' والد' بہن اور بڑی بھابی سوتے تھے۔ کبھی بھابی اور بھائی چھت سے کھاٹ باندھ کر بنائے گئے پرچھتی نما ٹانڈ پر سوتے تھے۔ اسی کمرے میں سب کے کپڑے لتے رکھے رہتے تھے۔ ایک دن بڑی بھابی کی انگیا دیکھ کر پوچھا۔ "اسے کیسے پہنتے ہیں؟" بھابی نے ہنستے ہوئے مزہ بھی لیا اور غصے کا مونہہ بنا کر دھول بھی جمائی۔ والد بہت رات گئے شہر سے لوٹتے تھے۔ بہن آدھی آدھی رات تک منظوم رامائن کی کہانی سناتی رہتی تھی۔ سیتا اور مندوری کی گریہ زاری سے کمرے کے ماحول میں اداسی گھل جاتی۔ ماں گہری آہیں بھرتی رہتی جن کا درد آج بھی میرے اندر رچا ہوا ہے۔

۱۹۴۷ء سے کوئی برس بھر پہلے گاؤں چھوڑ کر شہر آنا پڑا۔ سارے خاندان کے لئے ایک ہی کمرہ۔ دونوں بہن بھائیوں کے لئے پڑھنے کو ایک ہی چراغ کی روشنی۔ موسی کا لڑکا بہن کو پڑھانے آتا تھا۔ ماں مجھے بھی اس سے کچھ سیکھ لینے کے لئے کہتی مگر میں اس سے کچھ نہیں سیکھ سکا۔ کتاب بھلے ہی میرے سامنے ہوتی مگر توجہ بھائی کی طرف ہوئی تھی جس کا ہاتھ کاپی کے بجائے پینٹ کے بٹنوں پر رہتا تھا۔ رشتے داریوں سے میری نفرت کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں ہماری بھری بھرائی دوکان جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ گھر کی روٹی سبزی بیچ کر چلنے لگی۔ سارا کمرہ سبزی کی امس سے بھرا رہتا۔ والد نے سپرٹ نما شراب پینا شروع کر دی اور ماں کے دل میں اکیس برس کے لٹھ ایسے جوان بیٹے کی موت کا غم پھر تازہ ہونے لگا تھا جو ہفتہ بھر بیمار رہنے کے بعد عین اس دن چل بسا تھا جس دن اس کی شادی تھی۔ اور میرا کمرہ مجسم نوحہ بن گیا۔ پھر ایک روز ایسا بھی ہوا۔۔۔۔ رات کا گھنا اندھیرا تھا۔ میں کھیل کر لوٹا تھا۔ صحن میں چراغ جل رہا تھا' مگر نظر کوئی نہیں آ رہا تھا۔ سیدھا کمرے میں گھسا۔ اندر دو جسموں کو ایک دوسرے سے پرے سرکتے دیکھا۔ ماں تو ایک دم باہر آ گئی مگر والد نشے میں دھت آزار بند باندھنے کے لائق بھی نہ تھے۔ کہیں کوئی میرا کمرہ ہوتا تو میں سیدھا وہیں جاتا۔ بے پردہ ماں باپ کو دیکھ کر اس روز تو شرم سے زرد پڑ ہی اٹھا تھا' آج بھی اس واقعہ کو یاد کر کے اپنے کمرے سے وہی بیگانگی پیدا ہوتی ہے۔ ایسے کمرے میں کوئی اپنے جیسا کیا کر

سکتا ہے؟

پھر میرا کمرہ اس بڑے صحن والے کمرے سے ایک میانی نما کمرے میں تبدیل ہو گیا' صرف دو کھاٹوں کی جگہ- دوسری کھاٹ صرف سوتے وقت ہی ڈالی جاتی تھی- اس میانی کے نیچے مالک مکان کی دوکان تھی- وہ گئی رات تک چارپائیوں کے پائے ٹھوکتا رہتا تھا- ساتھ میں زور زور سے گوربانی بھی پڑھتا تھا- اس ورکشاپ کے ترنم میں میں بھی اپنی نظمیں گڑھتا تھا- یہیں میرا پہلا ایم- اے پروان چڑھا اور یہیں پر نظموں کے پہلے مجموعہ "سکدا شہر" کا خاکہ تیار ہوا- ماں دیر رات تک سوت کاتتی رہتی- پڑھنے کا خبط تو ساتھ لے کر پیدا ہوا تھا- ماں چرخہ کاتتی ہوئی خیالوں میں ڈوبی رہتی اور میں کتابیں پڑھتا رہتا- چھٹی کے روز کبھی بہت سارا پڑھ لینے کو جی کرتا تو کوئی اوڑس پڑوس کی عورت لمبی کہانیاں لے بیٹھتی- یہ کوئی نئی مجبوری تو نہ تھی- میرا ماحول میری عادت کا ہی جیسے حصہ بن گیا ہو- جب بھی دل اکتاتا تو گورکی کی وہ مالکن یاد آتی جو اس کے رات کے وقت برجی پر بیٹھ کر پڑھنے کے لئے اکٹھے کئے ہوئے موم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی چھپا دیا کرتی تھی تاکہ اس کا نوکر نہ پڑھ سکے اور میں پھر اپنے کمرے کی تقدیر کو اپنا بنانا شروع کر دیتا- یہ بھی کیا مجبوری ہوئی کہ آدمی اپنے دوستوں سے بھی گھر پر نہ مل سکے- حیرت ہے کہ آج تک "اپنے" کمرے کے متعلق کوئی نظم کیوں نہیں لکھ سکا- تاہم' یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہر نظم کے پیچھے کسی کمرے کا احساس ہو-

اب جس کمرے میں ہم گئے' وہ بھی ڈیوڑھی اور صحن کے بعد پیچھے کا کمرہ تھا- میرا والد اور ماں کا کمرہ' جہاں میں نے بڑے چاؤ سے ایک تصویر لگائی تھی- اس میں چار چہرے تھے اور اس کا عنوان تھا---- آنسو! تین چہروں پر کہیں بھی کوئی آنسو نظر نہیں آتا تھا پر لگتا تھا کہ ابھی کوئی آنسو ٹپکا کہ ٹپکا---- کیا یہ چہرے ہم تینوں کے چہرے تھے؟ چوتھا چہرہ آنسو والا تھا- تینوں چہروں میں سے کب کوئی چوتھا روپ دھار لیتا تھا' یہ صرف کمرہ ہی جانتا ہے---- اس دیوار پر اک اور تصویر تھی' خان عبدالرحمان چغتائی کی غالب کے ایک شعر کی رنگوں میں پیش

کاری!---- وسیع و عریض بیابان میں ایک بے برگ' لنڈ منڈ درخت جس کے پاس ہی ایک پھول میں چراغ جلتا ہوا دکھایا گیا ہے- یہ شائد میرے کمرے کا ماضی الضمیر تھا جہاں اپنی نظم کی لو سے میرا اداس کمرہ جگمگاتا رہتا تھا- اسی کمرے میں میری نظم کی طرح ہی "وہ" میرے سانسوں میں گھل گئی تھی- اسی کمرے میں اس دن لوگ آئے تھے اور مجھے اس کے ساتھ پہلا اور آخری فیصلہ لینے کے لئے کمرے کی چھت پر جانا پڑا تھا- میں نے اس سے کہا تھا- "یہ کھیل میں نہ کھیل سکوں گا- تم میرے راستہ میں نہ آؤ!" مگر اس کی بات سن کر میں ایکا ایک کانپ اٹھا تھا---- "اب تو بہت دور آ چکی ہوں- لوٹنا اب میرے بوتے میں نہیں!"

دس برس کے طویل وقت تک وہ میری کائنات کو رنگتی رہی- مگر ہر بار اپنے کمرے کا عدم وجود آنکھ میں کرکری کی طرح کھٹکتا رہا- دس برس تک ہماری محبت سائیکل کی کانٹھی یا سڑکوں کے کمروں میں ہی باتیں کرتی رہی- کئی بار جب وہ گورے رنگ سے شیام رنگ بدلنے کے لئے بے صبر ہو جاتی تو سوچتا' کسی آدم یگ میں ہی جی لیتا' کوئی تنہا غار تو نصیب ہو جاتی جہاں میں کسی کی ساری خلش اور بے صبری سانسوں میں تحلیل کر لیتا- اس کمرے میں میرے کمرے کی نشانی بس اتنی سی تھی کہ میری عمومی سائز سے بھاری کھاٹیں اور پانچ چھ تکئے پڑے ہوتے جن کے ساتھ ٹیکا لگا کر میں پڑھتا لکھتا تھا- کتنی بڑی پہچان تھی میرے کمرے کی- یہ پڑھنا بھی عجیب تھا- والد زیادہ نشہ کرنے کی وجہ سے دماغی توازن کھو بیٹھے تھے اور ان کی صحت کی کڑی نگرانی و دیکھ بھال میرا فرض بن گئی- وہ جلد سو جاتے اور اس حالت میں پڑھنا ممکن نہ ہوتا- ان کی بیماری کے لئے زیادہ سے زیادہ نیند ضروری تھی اور میرے لئے جاگتے رہنا- ایسے میں جونہی کبھی روشنی میں ان کی آنکھ کھل جاتی تو گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی- ان کو انکار کرنا مرض کو طول دینے والی بات تھی- کئی بار ہم ماں بیٹا روہانسے ہو جاتے اور ان بجھے آنسوؤں کی زندگی جیتے- اس طرح کی حالت میں ہی ماں دل کی مریضہ بن گئی- ماں کی برداشت اور درویشی دیکھ کر بابا فرید کی پیڑوں کی عمر والی بات یاد آ جاتی- گھر کی پرانی چار کرسیاں اور میز اسی کمرے

میں آئی۔ مگر یہ میز مطالعہ کی میز نہ تھی' تپائی تھی۔ پڑھنے کے لئے تو بڑا نواڑی پلنگ تھا جس کے پاس کیل سے تار لٹکا کر میں ٹیبل لیمپ کا کام لیتا تھا۔ بیٹھ کر یا لیٹ کر لکھنے پڑھنے کا ہی نتیجہ تھا کہ یونیورسٹی میں جب لگا تار آٹھ گھنٹے ٹیبل ورک کرنا پڑا تو روز کمر درد کی گولیاں کھانا پڑتی تھیں۔

چوتھا کمرہ دوسری منزل کا چوبارہ تھا جو گرمیوں میں بھٹی کی طرح تپنے لگتا اور سردیوں میں ضرورت سے زیادہ ٹھنڈہ ہو جاتا۔ محبت کرنے والوں نے یہاں بھی کوئی کسر نہیں رہنے دی اور ہم نے اپنے کام کو ہی پرائیوسی کا لیبل لگا دیا۔ حسرت ہی رہی کہ محبت کرنے والے کو کسی "اپنے کمرے" کی گرمائش دیتے' کہیں ہم کو بھی سانسوں کی تاثیر کا علم ہوتا۔ مگر شاباش ہے دوستوں کو جنھوں نے ہر ضرورت پڑنے پر اپنے کمروں کی گرمائش ادھار دے دی۔ مگر ادھار کے لمحوں میں جسموں کی برف بھی کبھی پگھلتی ہے! یہی وجہ ہے کہ محبت کرنے والوں سے اکثر پیار کے کرتبوں میں "اناڑی" ہونے کا خیال خاصل کرنا پڑا۔ یہ کہنے میں مجھے کوئی تامل نہیں ہے کہ تخلئے کے عدم وجود کے باعث اور پیار کرنے والوں کی موجودگی کے باوجود پیار کرنے کا ڈھنگ شادی کے بعد ہی آیا۔ مگر پیڑوں کی عمر والے پھر بھی سرکنڈوں میں پریت کی ریت نبھاتے رہے۔ ہوس ایسی شے ہے جو سدا غیر وقوع کی طرف دیکھتی ہے۔ جوں جوں اسے پچھاڑا ہے توں توں یہ منہ زور آگے ہی آگے بڑھی ہے۔ اور میں نے بھی کون سی کمی رکھی ہے؟ ان کمروں کو خوابوں کی بارہ دریوں کی طرح استعمال کیا ہے۔ یہیں یاروں کو دیکھ کر "واہ بچن!" کہا ہے اور دوستی کی ہیر کو سینے سے لگایا ہے۔ جب بھی کبھی ایک یا دو روز کے لئے باہر گیا ہوں ان "گورودوار" جیسوں کے پاس پہنچنے کے لئے بے قرار ہو اٹھا ہوں۔ نہ ہوؤں کا یہ کیسا گھر بیراگ ہے؟

پانچویں جگہ دو کمروں کا کھلا گھر تھا۔ ایک کمرہ والدین کے لئے اور دوسرا میرا اور بیگم کا شادی کے بعد میرے پاس صوفے تھے' شگار میز تھی' اور' اور سازو سامان۔ لیکن..... پڑھنے والا کونہ پھر وہی میاں بی بی والا ڈبل بیڈ! میں لکھنا چاہتا بیوی جلدی سونے کی ترغیب دیتی۔ آخر بیوی کا گرم جسم آنکھوں میں ابھرنے لگتا۔

الفاظ کے ستارے بلوریں پیکر کے ترمرے بن جاتے۔ کئی بار دوست آدھی آدھی رات تک ادب پر مباحث کرتے رہتے اور بیوی دکھتے ہوئے بدن سے باہر دہلیز میں بیٹھی سونے کی گھڑیاں گنتی رہتی۔ اس طرح دونو طرف کا کتنا کچھ کھو گیا ہے، کم سے کم میرے لئے کچھ کہنا تو بس کے باہر کی بات ہے۔ اسی کمرے میں اپنے دو بچوں کی آمد کا استقبال کیا ہے۔ اس طرح ان کمروں کا چھوٹا چھوٹا چاؤ، بے آرامی، کم خوابی، انتظار اور پیاس میرے مطالعہ اور تخلیق سے ہم آہنگ بھی ہیں اور دوچار بھی۔ آخر ہم ٹیبو سماج میں جیتے ہیں۔ اور کچھ اس طرح کہ میں بھی سوچنے لگتا ہوں---- سوچتا ہوں، کبھی کسی کی تسلی اور طمانیت بھی ہوئی ہے؟ اور پھر حاصل میں سے ہی رنگ برنگی پھلجڑیاں چھوٹتے دیکھتا ہوں---- ایک کمرہ---- اپنی ضرورتوں، محرومیوں سے بھرا ہوا---- کمرے میں.....

بچے، بیوی، ماں، شعریار اور میں----

ان پتوں میں سرسراتی ہوا کی طرح بہنا چاہتا ہوں!
اس کہکشاں میں روشنی کے دائرے کی طرح پھیلنا چاہتا ہوں۔
اس زمین کے چپے چپے سے جھرنے کی طرح پھوٹنا چاہتا ہوں۔
اس مرمریں اجالے میں آگ کی لپٹ کی مانند جلنا چاہتا ہوں۔
ان کی بوچھاڑ سے سر سے پاؤں تک شرابو ہونا چاہتا ہوں.....!

جبسیر بھلر 1941

بتھورا گڑھ میں میرا کمرہ پتھر کا بھی ہو سکتا تھا مگر پہاڑ کی ڈھلان پر بنا ہوا یہ کمرہ لکڑی کا ہے اور میں نے دور باہر سے دکھ جانے کے خوف سے کمرے میں کبھی کوئی دیا سلائی نہیں جلائی۔

گھاٹی کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے لگا ہوا میرا بستر ہے۔ بستر میں نیم دراز ہو کر میں لکھتا ہوں، نیم دراز پڑھتا ہوں اور نیم دراز سوچتا ہوں۔ کھڑکی کے باہر گھاٹی میں شام کے وقت بادل جمع ہو جاتے ہیں۔ ان بادلوں میں ٹیڑھی میڑھی لکیر سی، تیز بہتی ندی بھی چھپ جاتی ہے اور سیڑھیوں جیسے کھیت بھی۔ بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی پنچ چکی کی برف سے لدی ہوئی چوٹیاں ایسے وقت میں بہت سے رنگ بدلتی ہیں۔ غروب ہوتے آفتاب کی آخری کرنوں میں برف کا چہرہ گلابی ہو جاتا ہے اور آفتاب کے آنکھ میچتے ہی برف نیلی پڑ جاتی ہے۔

چارپائی کے ساتھ رکھی ہوئی میز پر بہت بکھراو پڑا رہتا ہے---- بے ترتیب پڑی کتابیں، اخبار، رسالے، فائیلیں، کچھ لکھے اور کچھ ان لکھے خط اور کاغذ---- میرا بیٹ مین شروع شروع میں میز کو سلیقہ سے رکھنے کی سعی کرتا رہا مگر اب اس

نے ہار مان لی ہے۔

اندھیرا ہونے پر میں کھڑکی کے آگے دبیز پردہ تان کر رضائی اپنے گرد کس کے لپیٹ لیتا ہوں۔ سردی سے کپکپی سی آتی ہے۔ میں پیشانی پر وکس مل کر لکھنا شروع کرتا ہوں۔۔۔۔ اس کمرے کے سارے موسم گرمائی چاہتے ہیں.....

شام کی رپورٹ دینے کے لئے حوالدار میجر آ جاتا ہے۔ ایڑیاں بجا کر فوجی سلام دیتے ہوئے کہتا ہے۔۔۔۔ "سر' سب ٹھیک ٹھاک ہے..... میں جانتا ہوں' کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ میری تخلیق کی ہوئی کائنات تحس نحس ہو جاتی ہے۔ جو کردار قریب سرک آئے تھے' کہیں چھپ سے گئے ہیں۔ کونے جانے' محاذ پر گئے ہوئے سپاہی کی طرح اب وہ لوٹیں گے یا نہیں!

سامنی دیوار پر وہی' پربھا کی ایک پینٹنگ کی نقل ہے..... عورت کا پھیلا ہوا ہاتھ اور چہرے پر بھوک کا کرب..... میری نظر پینٹنگ کے متوازی لٹکتی ہوئی اپنی وردی پر ٹک جاتی ہے۔ مجھے بیٹ مین پر غصہ آتا ہے وردی کتنی غلط جگہ پر لٹکائی ہے۔ سویرے ہی اس سے وردی کا مقام بدلنے کے لئے کہوں گا۔

حوالدار میجر کے جانے کے بعد میں برابر کے کمرے والے ڈاکٹر کے پاس چلا جاتا ہوں۔ وہ میرے سامنے عریاں تصویروں والے کتنے سارے رسالے بکھیر دیتا ہے۔ میں اٹھنے لگتا ہوں تو وہ روک لیتا ہے۔۔۔۔ "بیٹھئے' آپ کو کوئی نئی چیز سناتا ہوں!"

وہ ٹیپ ریکارڈ "ساؤنڈ آف سیکس" کا نیا خرید کردہ کیسٹ چڑھا دیتا ہے۔۔۔۔ "جانتے ہیں' بڑی مشکل سے بلیک میں ملا ہے!"

عورت مرد کے جماع کے وقت کی سسکتی آوازیں اپنی عریانی لئے کمرے میں پھیل جاتی ہیں۔ ڈاکٹر میری طرف دیکھتا ہے اور کھل کر ہنستا ہے۔

میرے کمرے میں کتابوں نے شرمسار ہو کر ایک دوسری میں منہ چھپا لیا ہے۔ تصویر والی عورت کا پھیلا ہوا ہاتھ اس کی آنکھیں ڈھانپتا ہوا پیشانی پر آ گیا ہے۔۔۔۔ اور عریاں سانس اور تیز ہو گئے ہیں۔

میں جانتا ہوں، کنواری عمر کو لگے الزام کی طرح یہ کمرہ بھی میری زیست کے سالوں پر پھیل گیا ہے۔

.....

پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھتا ہوں تو کمروں کی اک لمبی قطار ہے، پنکھری چھاؤں کی طرح جہاں بھوری چیونٹیاں بھی رینگتی تھیں اور کبھی کبھار سرد ہوا بھی بہتی تھی۔ مگر کمروں کی طرف لوٹنا اپنے آپ کی طرف لوٹنے جیسا نہیں لگ رہا ہے۔

تپتی دوپہر میں پیروں کے چھالوں سے بچنے کے لئے اچکا اچکا کر کبھی کالی سل پر پاؤں دھرتا ہوں کبھی سفید پر۔ عمر کی دوپہر کی طرح سلیں بھی سب کی سب تپ رہی ہیں۔ لگتا ہے'---- یہ سفر نامہ کمروں کا نہیں، کیموں کا ہے۔ تبھی تو یہ کمرے لین دار کی طرح راستہ روک کر کھڑے رہے ہیں۔

خالصہ کالج امرت سر کے نزدیک امرت ہوسٹل کے سامنے والی گلی میں بائیں ہاتھ پہلا دروازہ میرے اس کمرے کا ہے جہاں میں نے پہلی کہانی لکھی تھی۔ کہانی ختم کر کے سویا تو رات ڈھل رہی تھی۔ نجانے کیسے ہوا کہ ایک چڑیا میری کروٹ کے نیچے آ کر مر گئی اور میری باقی رات آنکھوں میں ہی بیت گئی۔ اب بھی جب کوئی "بنجر زمین" کی بات کرتا ہے تو مجھے وہ مری ہوئی چڑیا بہت یاد آتی ہے۔

یہ کمرہ گلی کی سطح سے نیچا تھا۔ گندے نالی کا پانی اکثر اندر آ جاتا تھا۔ کمرے میں بدبو پھیل جاتی تھی۔ ارزاں دھات پر سونے کا ملمع چڑھانے کی طرح میں دھوپ جلا لیتا تھا۔

اس اندھیرے کمرے میں نہ کبھی دھوپ آتی تھی اور نہ کبھی سورج مکھی کھلتے تھے۔ مگر پھر بھی اس کمرے میں ہم ایک ایک کر کے تین دوست اکٹھے ہو گئے تھے۔ کمرے کا درمیانی دروازہ صحن میں کھلتا تھا۔ اس پر پردہ لٹکا رہتا تھا۔ پانی کے لئے ہم کو گلی کے موڑ پر لگے ہوئے کمیٹی کے نلے کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔ کسی ضرورت

کے لئے ہم نچلے دروازے کے محتاج نہیں تھے مگر اچانک ہم دروازوں کے دو سوراخوں کے محتاج ہو گئے تھے۔

مالک مکان کی کالج میں پڑھنے والی لڑکی اپنی عمر کی سی تھی' نہایت شوخ و شنگ۔ وہ کالج سے لوٹتی تو سائیکل ڈیوڑھی میں رکھتے ہی گانے لگتی۔ ہمارے اندھیرے کمرے میں گویا چراغ جل جاتے۔ کمرے میں ہلچل مچ جاتی۔ ہم ایکبارگی دروازے کے سوراخوں کی طرف لپکتے۔ پہلے پہنچنے والے سوراخ ہتھیا لیتے۔ تیسرا جنا بستر اکھٹا کر کے جلدی سے دوسری چارپائی پر پھینک دیتا اور چارپائی کو دیوار کے ساتھ کھڑی کر کے بان میں انگلیاں پھنسا کر روشن دان تک پہنچ جاتا۔

اس سے زیادہ ہم نے چھندی کو کبھی نہیں دیکھا تھا مگر اس کی گنگناہٹ ہمارے بدبو دار کمرے کی مہک تھی اور مہک کے عالم میں ہم نے پیار جیسی ایک سطر کمرے کی دیوار پر جلی حروف میں سجا لی تھی---- ہائے چھندئے! رت ہے بہار کی.....!

اس ماہ چھندی کا باپ کرایہ لینے آیا تو عمر کی شرارت ایسے بول اس کی پیشانی سے ٹکرائے اور اس نے جلد ہی ہم سے کمرہ خالی کروا لیا۔

تب یہ خیال نہ تھا کہ وہ کمرہ "دوستی کے کمل پھول" کی بنیاد بن گیا ہے۔

سنا ہے' کئی کمرے محبوبہ کے بدن ایسے بھی ہوتے ہیں اور دل چاہتا ہے کہ کچی شراب نب کر سر کو چڑھے رہیں..... شائد ہوتے ہوں گے۔ مگر مجھے تو یہ معلوم ہے کہ زیادہ تر کمرے اس عورت کے اکیلے پن جیسے ہوتے ہیں جو بیوی ہوتی ہے۔ مجھے تو بہت سے کمرے اس اجنبی عورت کی طرح ہی ملے ہیں جس کا ساتھ سانسوں کی مجبوری ہوتا ہے۔

گاندھی آشرم میں میرا بیرک ایسا کمرہ نہ تو محبوبہ کے بدن جیسا تھا اور نہ ہی بیوی کے اکیلے پن جیسا۔ میرا وہ کمرہ گرگٹ ایسا تھا۔ روز رنگ بدل لیتا تھا۔

ان دنوں میں آشرم کے اخبار "بھودان" کا تیس روپے ماہوار کا مدیر معاون تھا اور آشرم کی چار دیواری سے باہر نکلنے کے لئے پڑھائی بھی کر رہا تھا۔

سدا کی طرح ہمارا دن سویرے چار بجے شروع ہو جاتا تھا۔ "گاندھی چرخہ" ہاتھ میں لئے آشرم کے سبھی گاندھی وادی سردی میں ٹھٹھراتے ہوئے باپو کٹیر پہنچ جاتے تھے۔ جائے عباد کی سرد بجری پر بیٹھ کر گاندھی چرخے پر تار کاتتے ہوئے ہم دعا کے بول اونچی آواز میں گاتے تھے۔۔۔۔ "اٹھ جاگ مسافر بھور بھئی' اب رین کہاں جو سووت ہے!"

ایک روز دعا کے بعد لوٹے تو کمروں کی تلاشی ہو چکی تھی۔ تلاشی پہلے بھی بہت بار ہوئی تھی لیکن اس روز کی تلاشی انڈوں کے چھلکوں' سگریٹوں کے ٹکڑوں یا سینما کے پھٹے ٹکٹوں کے لئے نہیں تھی بلکہ مل کے بنے کپڑوں کے لئے تھی۔ ویسے تو آشرم میں ہم سب کھدر پوش تھے مگر بستر کی چادر یا تکئے کے غلاف وغیرہ مل کے بنے کپڑے کے استعمال کر لیا کرتے تھے۔ اور یہ سنگین جرم تھا۔

ہمارے پہنچنے تک کپڑوں کے ڈھیر کو آگ لگائی جا چکی تھی۔ اس ٹھنڈی' خنک سویر کو دوسروں کے ساتھ آگ کے پاس کھڑا میں بھی ٹھٹھر رہا تھا۔

آشرم کے اس کمرے میں میرا نجی چھ نہیں تھا۔ وہاں کسی کا بھی نجی کچھ نہیں تھا۔ باہر جاتے وقت نہ کمرے پر تالہ لگتا تھا' اور نہ اندر ہی کچھ دھرا رہتا تھا۔ بھائیں بھائیں کرتے کمرے کی دیوار پر مہاتما گاندھی کی چوکھٹ میں جڑی تصویر آویزاں تھی جس پر ٹوٹے ہوئے سوت کی ایک انٹی لٹکتی رہتی تھی۔ چوکھٹے کا بالائی حصہ پرندوں کی بیٹ سے بھرا رہتا تھا۔ چڑیاں چوکھٹے پر بیٹھ کر سوت کی انٹی سے اپنے گھونسوں کے لئے دھاگے کھینچتی رہتی تھیں۔ ایک کونے میں لکڑی کا دیوان تھا جس پر بیٹھ کر میں کام بھی کرتا تھا اور آرام بھی۔ برآمدے میں پڑا گاندھی چرخہ' کیل پر ٹنگی سوت کی انٹیاں اور انٹیوں کی طرح ہی کیل پر ٹنگے ہوئے خیالات۔۔۔۔ یہ سب کچھ میرا تھا۔ کھدر کے مٹیالے کپڑوں سمیت میرا تھا جن کو دھونے کے بعد پریس کرنے کے لئے تکئے کے نیچے رکھ لیتا تھا۔

وہاں میرے دروازے تک بہت بڑے بڑے رہنما چل کر آئے تھے' پنڈت جواہر لال نہرو' ڈاکٹر رادھا کرشنن' شریمتی اندرا گاندھی اور' اور نہ جانے کون

کون- یہ الگ بات ہے کہ تب میرا کمرہ پہلے جتنا بھی میرا نہیں رہتا تھا- تب اس کمرے کی پیشانی پر کسی محکمہ کا کوئی بورڈ لٹکا دیا جاتا تھا' کبھی ہتھ کرگھاؤ بھاگ' کبھی کھادی وبھاگ' کبھی صابن وبھاگ اور کبھی.....! اووں کے ساتھ میں نے بھی دہلیز میں کھڑے ہو کر لیڈروں کے گلے میں سوت کی انٹیاں ڈالی تھیں (وہاں ہاتھ سے کاتے ہوئے سوت کی انٹیاں صرف لیڈوں کے گلے میں ڈالنے کے کام آتی تھیں' کپڑا بننے کے نہیں) لیڈر اپنے ہاتھ سے بنیادی پتھر لگاتے' فوٹو لئے جاتے' تقاریر ہوتیں- تالیوں کے شور میں وہ گرانٹ منظور کرتے اور چلے جاتے- لیڈر کے جانے کے بعد میں اپنا دیوان لا کر پھر اس کمرے میں رکھ لیتا تھا-

پہلی گرانٹ ملنے تک پہلے لیڈر کے دست مبارک سے لگایا گیا پتھر میرے کمرے کے باہر قائم رہتا اور گرانٹ ملنے کے بعد وہ پتھر اکھاڑ کر فالتو سامان والے کمرے میں ڈال دیا جاتا- اور اس کے بعد نئی گرانٹ کے لئے میرے کمرے کے لئے کوئی نیا نام سوچا جاتا' کسی اور لیڈر کے لئے نای پتھر تیار کروایا جاتا-

..... اور نئے رہنما کے آنے سے پہلے پہلے میں اس کے گلے میں ڈالنے کے لئے سوت کی انٹی بھی تیار کر لیتا تھا اور اپنا دیوان ٹکانے کے لئے کوئی وٹ والی جگہ بھی ڈھونڈ لیتا تھا.....

خانہ بدوش جانے کون سی اوٹ کو اپنا کمرہ کہتے ہوں گے؟

یہ فوجی بننے کے بعد یک بات ہے---- ایک شام شہر سے لوٹا تو ایک اجنبی عورت نیم عریاں سی میرے بستر پر لیٹی ہوئی تھی- اکیلے مرد کے کمرے میں ایک اکیلی عورت!---- دہلیز سے اندر پاؤں رکھتے رکھتے میں پسینہ پسینہ ہو گیا-

اس عورت کے گرد مقدس ہوا تھی- اس عورت کے پیچھے روشن ہالہ تھا جیسا تصویروں میں عظیم ہستیوں کے پیچھے ہوتا ہے- میں تب نہیں جانتا تھا کہ وہ عورت میری کہانی "چار..... تین..... دو..... ایک" کی پشتی تھی- مجھے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ اس کا خاوند اندھیرے کونے سے اس کو افسروں کی میس کی دیوار پھندوا کر خود پیڑ کے نیچے اندھیرے میں کھڑا بلغم تھوکتا رہتا تھا---- اور آج بہت برس بعد

مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ پشی اپنے جسم کی کمائی سے کٹے پھٹے کپڑوں والے اپنے مرد کی جان بچا بھی سکی یا نہیں۔ آج مجھے صرف اتنا پتہ ہے کہ کہانیوں کے پاؤں ہوتے ہیں اور وہ چل کر کسی بھی کمرے تک پہنچ سکتی ہیں۔

بہت برف پڑ رہی ہے' زندوں پر بھی اور مرے ہوؤں پر بھی۔ سال اس برف پر سے پھسل رہے ہیں اور بس پھسل رہے ہیں..... اور میں رکنے کی کوشش میں کبھی اس دروازے کی صانقل کو پکڑتا ہوں اور کبھی اس دروازے کی صانقل کو۔ میں نے پہلے کبھی اتنی برف نہ دیکھی تھی۔ برف کبھی روئی کے گالوں کی طرح گرتی اور کبھی دانہ دار بورے کی طرح۔ میرے کمرے کی چھت سے برف کی سلاخیں نیچے کو لٹکتی رہتیں اور کبھی اپنے ہی بار سے لوٹ کر نرم برف کے سینے میں خنجر کی طرح کھب جاتیں۔

کمرے کے اندر بخاری سرسر ہوتی رہتی۔ کمرہ کچھ گرم ہو جاتا تو کھڑکی کے شیشے پر جمی ہوئی برف پگھل جاتی۔ کھڑکی سے کنجن جنگا کی چوٹی دکھائی دیتی اور نیچے ہزاروں فٹ گہری کھڈ! نظر کی حد تک گھنا جنگل اور لکیر سی دکھتی ندی! اس کھڑکی کے آگے بھی دوہرا کمبل تنا رہتا اور دروازے کے آگے بھی کمرے کے باہر برفیلا جھکڑ چلتا تو آگے لگنے کے ڈر سے بخاری بند کرنا پڑتی۔ اس وقت موٹے اور دبیز کپڑے بھی حرارت کا سات چھوڑ دیتے۔ سویرا ہونے تک بوتل میں سرسوں کا تیل بھی جم جاتا۔ اور بالٹی کا پانی بھی۔ اس کمرے کی پہلی صبح کو میں نے لوہے کے مگ سے بالٹی کی برف توڑ کر استعمال کرنے کے لئے گرم پانی میں ملاتے ہوئے سوچا تھا' اس کمرے میں دو برس کا لمبا وقت کیسے بیتے گا؟---- اور اب وہ کمرہ بہت پیچھے رہ گیا ہے۔

اس کمرے میں میں نے اچھی بری بہت سی کتابیں پڑھی تھیں۔ اسی کمرے سے میں نے "ناگ منی" کو پہلی کہانی بھیجی تھی اور جواب میں امرتا پریتم نے لکھا تھا---- "جسویر! فوج کے بارہ میں گہرائی سے کبھی کچھ نہیں لکھا گیا۔ تم ضرور لکھنا!" ایسے دل جانے کیسا سہارا کھوجتے رہتے ہیں---- اس کمرے میں لکھنا میرا

ایمان ہو گیا تھا۔

شفاف راتوں میں اس کمرے کے باہر نرم گدے جیسی برف پر بیٹھ کر میں انگلی سے ٹھنڈی برف پر ایک ہی نام کئی کئی بار لکھتا تھا۔ وہاں آسمان بہت نزدیک ہوتا تھا اور میرا جی کرتا تھا کہ ہاتھ بڑھا کر ایک ستارہ اپنے لئے بھی توڑ لوں..... لیکن میرا ہاتھ ہر بار کوئی پور بھر نیچے رہ جاتا تھا.....

.....

• دو برس میں نے برفیں دیکھی تھیں۔ سچ مچ ہی مجھے سورج چاہئے تھا مگر اتنا رقیب نہیں کہ بدن جھلس جائے اور ہونٹوں پر پپڑی جمی رہے۔

مجھے سورج چاہئے تھا مگر اس قدر قرب نہیں کہ ہوا لرزتی رہے اور ریت کی لہروں پر حد نگاہ تک سراب پھیل جائے۔

مجھے سورج چاہئے تھا لیکن اتنا پاس نہیں کہ میرا خیمہ بھٹی بنا دن رات ریت کے سمندر میں ناؤ کی طرح تیرتا رہے۔

تروی میں سورج سچ مچ اتنا ہی نزدیک تھا۔ ماں جیسا کوئی پیڑ میلوں تک کہیں نہ تھا۔

تپتے ہوئے خیمے میں دن بھر نہ موسم کے پھولوں کی انتظار ہوتی تھی نہ بارش کی۔ ایسا وہاں کبھی کچھ نہیں ہوتا تھا۔

ہفتے کا ایک دن انتظار کا دن ہوتا تھا۔ ٹرک بڑ میر جا کر ہفتہ بھر کی اکٹھی کی ہوئی ڈاک' پرانے اخبار اور رسالے لے آتے تھے۔ یہ نعمت قصے کے اندھے راجہ کو آنکھیں دلانے کے لئے سات سمندر پار سے لائے ہوئے کالے گلاب ایسی لگتی تھی۔

برف میرے ذہن پر پھیلی ہوئی تھی۔ ایک سانجھ تھی' برف' ریت اور سورج کے بیچ! انتظار..... انتظار.....! ..... اور بس' انتظار---- شائد اسی سانجھ کی دولت میں نے ریگستان میں بیٹھ کر ایک جلتی ہوئی دوپہری میں برفوں کی کہانی

لکھی تھی، "ٹوٹے تاروں کی چتا....."

برفوں میں میں مہینوں سورج کا انتظار کرتا تھا اور یہاں تنبو میں بیٹھ کر ہمیشہ ڈھلتی دوپہری کا انتظار ہوتا تھا۔

سورج کی تمازت مدھم پڑتی تو میں اپنے خیمے میں بیٹھا نیولوں کو آپس میں دھینگا مشتی کرتے ہوئے جھاڑیوں کی اوٹ میں گم ہوتے دیکھتا۔ پرندے پتہ نہیں، کہاں سے آ کر چہکتے۔ ہرن ریگستان میں چوکڑی بھرتے بڑے اوپرے لگتے۔ صحرا میں ان کو نرم گھاس نہ جانے کہاں میسر آتی ہوگی؟ کہاں ملتا ہوگا جھیل کا پانی؟

اچانک جھرجھری سی آتی۔ مجھے بڑھتی ہوئی سردی کا خیال آتا۔ اس سے پیشتر کہ دانت بجنے لگیں، لحاف سے ہاتھ نکالنا دشوار ہو جائے، مجھے لکھنے پڑھنے میں کچھ وقت لگا لینا چاہئے۔ میرا یہ ارادہ ابھی عمل میں نہیں آیا ہوتا کہ برابر کے خیمے والا میجر بندوق ہاتھ میں تھامے آ دھمکتا ہے---- "کمال ہے، اس وقت بھی خیمے میں؟..... چلو اٹھو، شکار کو چلتے ہیں۔" میں اس کے ساتھ جانے کی سوچتا۔ کل تڑکے ہی سورج کے پوری طرح تمازت چھوڑنے سے پہلے کچھ تو کرنا پڑے گا۔ یوں تو کسی تیسرے موسم کے انتظار میں عمر ہی گزر جائے گی!"

.....

ریل کے سفر میں پیچھے کی طرف دوڑتے ہوئے پیڑوں کی مانند سارے کمرے ایک ایک کر کے لوٹ گئے ہیں، سارے کمرے ایک ایک کر کے لوٹ جائیں گے۔ کوئی کمرہ بھی تو ہاتھ کی لکیروں جیسا نہیں ہوتا کہ ساتھ چپکا رہے!..... اور میں دیواروں کا طواف بیچ میں چھوڑ کر دیوار کی طرف ہی لوٹ آیا ہوں۔ تاہم میں کب منکر ہوں کہ میں نے ان دیواروں سے کچھ نہیں لیا---- میں نے بہت کچھ لیا ہے۔ اور وہی بہت کچھ میرا حاصل ہے۔ لیکن ان دیواروں کو جو کچھ میں نے سونپا ہے، اس کا حساب صرف میرے چہرے کے پھیکے پڑ رہے رنگوں میں ہے، اور کہیں

نہیں!

کسی ان چاہی عورت کے ساتھ عمر کاٹنے کی طرح مجھے ان کمروں میں رہنا ہی تھا۔ کرائے کی عورت کی طرح کمروں نے بھی اس عرصہ کے لئے مجھ سے نبھاؤ کرنا ہی تھا۔ کبھی کبھار مجھے دیواروں کا ماتھا چومنا ہی تھا' محبوبہ کے ہونٹوں کی طرح۔ اب اس بات کا بھی کیا پردہ ہے کہ میرے کمروں کی دیواریں برہنہ تھیں۔ میرے کمروں کے پردوں میں سے آر پار دیکھا جا سکتا تھا۔ میرے کمرے آگ یک بھٹی بھی تھے اور برف کا سرد خانہ بھی۔ فحش بول میری دہلیزوں کو کچھ اس طرح بھی پار کر کے آ جاتے تھے جیسے چکلے کا دروازہ ہو---- میرے کمرے تو صحرا کے بیچ لگے خیمے ایسے ہی تھے---- دن میں آگ کے سمندر میں تیرتے تھے اور رات کو قطبین کی برف پر ہاتھ سینکتے تھے۔

کمرے کی تلاش لمبے سفر کے لئے اچھے ساتھی کی جستجو ایسی ہے۔ مگر تخیل کے کمرے کے نقوش دھندلے ہیں' بس ویسے ہی جیسے سپنوں کے دیکھے ہوئے چہرے پہچان سے پرے ہوتے ہیں---- میں اپنے کمرے کی ساری ہوا میں جینا چاہتا ہوں۔ میرے وہ کردار جو ہر اجنبی دستک پر جلا وطن ہو جاتے ہیں' میں انہیں اپنے سانس دینا چاہتا ہوں۔ میں ہرگز بھی اپنا کمرہ ایسا نہیں چاہتا کہ کوئی بھی قاسم میرے دروازے پر کھڑا ہو کر کہہ سکے---- "کھل جا سم سم!"

ایک کمرہ بنانے کے لئے یوں تو اینٹوں اور سیمنٹ کی ہی ضرورت ہوتی ہے---- سانس تو ہمیں اپنے ہی لینے ہوتے ہیں---- پر خوابوں کے کمرے کا سپنا ابھی تو حسرت جیسا لگتا ہے۔ سوچتا ہوں'---- اپنے وطن میں من کا چاہا کیا کچھ بھی نہیں ہوتا؟ نہ محبوبہ' نہ دوست' نہ بیوی اور نہ کمرہ!

یہاں ہر سانس لعنت ایسا کیوں ہے؟---- برابر کے کمرے میں ڈاکٹر نے "ساؤنڈ آف سیکس" کیسٹ کا دوسرا رخ لگا دیا ہے۔ عورت و مرد کے لمبے لمبے سانس' سسکیاں اور فحش بول میرے کمرے میں پھر پھیل گئے ہیں۔ اس نے آواز

اور بلند کر دی ہے تاکہ میں اس کی بیش قیمت ملک کے لئے واہ واہ کر سکوں۔
..... اور میں ابھی بھی لکھنے کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ اچانک میں قلم ایک طرف رکھ کر اٹھ گیا ہوں اور جھنجھلا کر اپنے آپ سے کہا ہے---- "میں صرف لکھتا کیوں ہوں؟ لڑتا کیوں نہیں؟"

سرجیت سنگھ سوکھی 1942

دوستو! آپ ہی بتلائیں، بھلا عقل گروں، بنجاروں اور پناہ گزینوں کے بھی کمرے ہوتے ہیں؟ عقل گر، بنجارہ اور پناہ گزیں لفظ پڑھ کر آپ کو حیرت ہوئی ہو گی لیکن میں حیرت زدہ نہیں کیونکہ ان میں سے ایک نہیں، تینوں لفظ میری ساری زندگی پر صادق آتے ہیں۔

اب تک میں سینتیس پت جھڑیں اور بہاریں بتا چکا ہوں یا وہ مجھے بتا چکی ہیں۔ اب گو بھرپور دوپہر نہیں رہی، پرچھائیاں ڈھل رہی ہیں، تاہم ابھی بھی خون گرم ہے۔ یہ جرم میں سرعام قبول کرتا ہوں کہ زندگی کے پانچویں سال سے لے کر اب تک میرا دل بھٹکتا رہا ہے۔ اس بے گھر اور بے کفن دل کو سمجھاتے سر کی نسیں بھی رہ گئی ہیں۔

دوستو! اسی بھٹکن نے مجھے سب سے پہلے میرے گاؤں جوڑے سے کیروں، نتھو چک، لوہ کے، گوپالے، گھوہالکے اور شہباز پور جانے والے راستوں پر بھٹکایا۔ جب بھی دل زیادہ اوداس ہوتا، میں مندرجہ بالا گاؤں میں لگنے والے سالانہ میلوں میں کبڈیوں کے موقعہ پر بیت بازی اور قصہ خوانی سننے کے لئے رات بے رات چل نکلتا تھا۔ پانچ سال سے لے کر اٹھارہ سال کی عمر تک (جبکہ میں خالصہ کالج امرتسر میں داخل ہوا) کے تیرہ سال مذکورہ بالا راستوں نے یوں نگل لئے جیسے دریا کے کنارے پر بے خبر سونے والے آدمی کو مگرمچھ نگل لیتا ہے---- گھر میں دادا دادی تھے ماں باپ تھے اور شائد محبت بھی تھی۔ مگر گھر کبھی اپنا نہیں لگا۔ اور جب گھر اپنا نہیں لگتا تو گھر کے کسی کمرے میں میری کیا سلام دعا وہ سکتی تھی؟

دوستو! جوڑے گاؤں کی گلیوں میں دھکے کھا کھا کر اٹھارہ سال کی عمر میں میں امرتسر پہنچ گیا۔ اس وقت تک گھر میں مفلسی کا بول بالا تھا' اس لئے دل کا اور تیزی سے بھٹکنا لازمی تھا۔ کالج کی تعلیم کے لائق گھر میں پیسے نہیں تھے لیکن میں پڑھنے کی اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔ تین کپڑوں اور تین سو روپلی کے ساتھ پناہ گزینوں کی طرح سرائے گورو رام داس میں پناہ لی۔ لیکن ایک ہفتہ سے زیادہ بھلا سرائے میں پناہ لی جا سکتی تھی؟ پھر بنجاروں اور سقلی گروں کی مانند پانچ حواس خمسہ سے بنانا پائدار جسم لے کر چھ مہینے جو ہیں اور امرتسر کے درمیان ریل گاڑیوں میں بھٹکتا رہا۔ گھر کو گھر نہ سمجھا تھا' پھر دوستو! آپ ہی بتائیں کہ شمالی ریلوے کے کسی ڈبے یا کیروں اور جنڈو کے ریلوے مسافر خانے کو اپنے کمرے کا درجہ کیسے دیا جا سکتا تھا؟

تعلیم مکمل کرنے کی تمنا لے کر میرے بھٹکتے دل نے کئی نام نہاد رشتہ داروں کے دروازوں پر دستک دی۔ مجھ ایسے خانہ بدوش کو ٹھہرانے پر بھلا کون آمادہ ہوتا؟ جو تیار بھی ہوئے' انو ہں نے کسی بھینگی' کانی' بدشکل' کم عقل اور بدکردار بٹیا کو "ڈسپوز آف" کرنے کے لئے میرے اوپر اپنے آپ کو "قتل گاہ" پیش کرنے کی شرط رکھی اور ساتھ یہ تحریص دی کہ میں یہ شرط پوری کر دوں تو دنیاوی نعمتوں کی مجھ پر بارش کر دی جائے گی۔ دوستو! اپنے دادا کا پوتا تھا اور اس نے صرف ایک بات میرے ذہن نشین کرائی تھی کہ "دو قدم کم چلنا' مگر چلنا آن کے ساتھ" سو اسی مقولے کی رٹ لگاتا رہا۔ پھر خالصہ کالج کے ہوسٹل میں چند روز گزارے' اور ہوسٹل کا کمرہ میرا کمرہ کیسے کہلا سکتا تھا؟

دو جگہوں پر ڈیڑھ ڈیڑھ' دو دو مہینے کچھ تسلسل سے گزارنے کا موقعہ ملا مگر جان بڑی ضیق میں پھنسی رہی۔ پہلے گھر کی مالکن نے پہلے ہی دن اعلان کیا تھا "یہ عالی شان کوٹھی' کاریں' فریج' ٹی وی اور لاکھوں کی دولت سب تمہاری ہے---- شرط صرف یہ ہے کہ مجھے ہمیشہ کے لئے اپنانا ہو گا!" تین بیٹیوں اور تین بیٹوں کی ماں ہونے کے باوجود وہ عورت اپنے بچوں کی بڑی بہن لگتی تھی۔ مگر میں خود سپردگی کے لئے آمادہ نہ ہو سکا۔ کئی بار ارادہ متزلزل بھی ہو جاتا تھا مگر دادا کی دی ہوئی

نصیحت بھری مدد ہوتی رہی۔ قریب سوا مہینہ اس "دیوی" کے مکان میں رات اور دن کے وقت "روم ریس" لگاتے ہوئے بتایا۔ جب نصف شب ہوتی تو وہ پوری یا نیم برہنہ حالت میں میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتی۔ اور میں گھبرا ہوا اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر آگے آگے دوڑنا شروع کر دیتا۔ وہ پنجوں کے بل ایک اچھے ایتھلیٹ کی طرح چل کر میرا تعاقب کرتی تھی۔ یہ ہر تیسری چوتھی رات ہوتا۔ میں چوبیس کمروں کے دو الگ الگ سیٹوں میں سے بھاگ کر آگے آگے نکلتا اور بڑی مشکل سے یا تو کسی کمرے کے اندر چٹخنی لگا کر بیٹھ جاتا یا دیواروں کے کندھوں پر پاؤں رکھ رکھ کر نیچے سڑک پر اتر جاتا۔ پتہ نہیں، وہ عورت کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ میرے پھسل جانے کے بعد وہ اپنے چار گھریلو نوکروں میں سے کسی ایک کو اٹھا کر "میرے" کہلانے والے کمرے میں لے جاتی اور اسے وہی "خدمت" بخشتی جو میں کرنے سے انکاری یا معذور تھا۔ دیوی جی نے قریب سوا مہینہ میرے ساتھ خوب آنکھ مچولی کھیلی اور مجھے بات بات پر تنگ کرنے لگی۔ سو دوستو! مہینہ بیس دن جھاڑ پھٹکار کھانے اور لعنتیں سننے کے بعد میں نے اس گھر کو الوداع کہہ دی۔

وہاں سے نکل کر ایک اور گھر میں "سر چھپایا۔" یہاں بھی مسئلہ ویسا ہی درپیش ہوا۔ مگر فرق یہ تھا کہ پہلی دیوی جی حمل کے چکر سے نجات پا چکی تھیں مگر نئی صاحبہ ہدایت کرتی تھیں کہ میں کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ دائمی طور سے معاملہ طے کر رکھوں (رقم خواہ کتنی ہی ادا کرنی ہو) سو مصیبت سابق ایسی ہی تھی۔۔۔۔ مجھے الگ کمرہ "الاٹ" ہوا، جس میں چار کھڑکیاں تھیں۔ دیوی جی ایک نہ ایک کھڑکی کسی وقت کھول جاتیں اور جیسے ہی میں کالج کا سبق پورا کر کے بتی گل کرتا وہ الائچی اور سکاچ کی سمت چھوڑتی میری شیل کی رضائی میں، جو اس نے خود مجھے دی تھی، آ گھستی۔ پہلے دن تو اس نے ذہن میں یہ بات ڈالی کہ میں اس کی آمد کو "چیونٹی کے گھر بھگوان" کی آمد مان لوں اور وہ مجھے گھر کا "گھر داماد" اور مالک ہونے کا اعلان کر دے گی (وہ گھر کی اکلوتی بیٹی تھی) لیکن تنگ بھگ ڈیڑھ مہینہ پہلے کی طرح ہی گھوڑ دوڑ ہوتے بیتا۔ نہ میں نے دیوی جی کو قبول کیا اور نہ ہی کوئی مکان

یا اس کا کمرہ میرے نام چڑھا۔

اپریل ۱۹۶۶ء سے دسمبر ۱۹۶۶ء تک میں نے بیشتر راتیں گورو رام داس لنگر سے "پرشادا چھکنے" کے بعد شری دربار صاحب کی پرکرما میں نیلی چھت کے نیچے بتائیں۔ اس لئے دوستو! ایک بات میں نے شدت سے محسوس کی نیلی چھت والا وسیع کمرہ میرا ہے۔ اسے اپنا کہنے سے مجھے بھلا کون روک سکتا ہے۔ اسی وجہ سے ۱۹۶۷ء سے لے کر اب تک روزانہ قریب سولہ گھنٹے اپنے "روزگار گرہ" میں یا لوگوں کی خدمت گزاری میں بتائے---- "روزگار گرہ" ایک ٹرسٹ ہے اور تمام پنجابیوں کی ملکیت ہے اور پنجاب روڈ ویز و پیپسو ٹرانسپورٹ کی بسیں اور ریل گاڑیاں سرکار ہیں جیسے میرے دوستوں کی کاریں اور جیپیں ان کی اپنی ہیں اس لئے چوبیس گھنٹوں میں سے آٹھ گھنٹے اپنے نہایت پیارے پیارے بیٹوں کی حسین، دلکش ناک نقشے والی اور سگھڑ ماں کے مکان میں گزارتا ہوں اور باقی سولہ گھنٹے نیلی چھت کے تلے! یہ نیلی چھت والا کمرہ ہی میرا کمرہ ہے۔ اس کو خالق نے پہلے سے ہی سجا سنوار رکھا ہے، اس لئے میں نے چپس کے فرشوں، رنگین پردوں، سرد ائر کنڈیشنروں اور اسی طرح کے دوسرے سامان عشرت کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔

۱۹۷۴ء میں اپنی رفیقہ حیات کے زیور فروخت کر کے میں نے گیارہ مرلے کا مکان خریدا۔ اس وقت میرا بڑا لڑکا ہونے والا تھا۔ ایک بات میرے ذہن میں بار بار آتی تھی۔ مجھے تو کوئی کمرہ یا گھر اپنے ساتھ نہیں باندھ سکا۔ اور میرا لنگوڑا دل ۲۰ جون ۱۹۴۲ء یعنی میرے روز پیدائش سے ہی بھٹکتا رہا ہے---- کہیں میرا بیٹا بھی ایسے ہی نہ بھٹکتا رہے---- اس کا کوئی اپنا کمرہ ہونا چاہئے۔ اس لئے میں نے والدین کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے مکان کی رجسٹری جیتھے دارنی ہرج[illegible]ر کے نام کروائی تاکہ بیٹا سمجھے کہ میرے باپ کی طرح میری ماں مستقل گرلی بنجارن یا پناہ گزین نہیں ہے اور میری ماں کا مکان میرا اپنا ہے!

❀❀❀

مندر 1943

میں شائد بہت عرصہ سے ایک کمرے کی تلاش کر رہا تھا---- اس کمرے کی جو کہ جب میں پیدا ہوا تھا' میرے ساتھ ہی پیدا ہو گیا تھا- مگر کہاں ہے وہ کمرہ؟ ابھی تک میں جان نہیں سکا ہوں.....

بس ایک خیال ہے اور خیال ہر لحہ بدلتا رہتا ہے اور اسی طرح میرا کمرہ بھی اپنی صورت اپنا تصور بدلتا رہتا ہے- میں شائد تعمیر کے بجائے تخریب کے لئے پیدا ہوا تھا- اور اس کی وجہ شائد وہ کمرہ ہے جہاں میں پیدا ہوا تھا- وہ کمرہ' اس کی بناوٹ' اس کے اندر کی جگہ سب کی یاد میرے ساتھ رہی ہے---- اس کمرے کا صرف ایک دروازہ تھا اور اس میں سدا اندھیرا رہتا تھا اور اس کمرے کی ایک ایسی بو تھی جو میری انتڑیوں میں اتر گئی ہے- اس کی دیواروں میں سے کچی مٹی کے ڈھیلے سے گرتے رہے تھے اور چھت سدا ٹپکتی رہتی تھی- اس کمرے میں کوئی فرش نہیں تھا- زمین سیلی رہتی تھی اور وہ کمرہ اور اس کی بدبو زمانے کی بدبو بن کر مجھے بیقرار کئے رہتی تھی.....

جب میں پیدا ہوا تھا' اس کے ساتھ ایک بیقراری پیدا ہو گئی تھی----
سارا گھر رو رہا تھا- میری ماں کی چیخیں آج تک میرے کانوں میں گونج رہی ہیں-
ایک غیر معمولی بچہ پیدا ہو گیا تھا- میرا سر بہت پھول گیا تھا اور سب کا خیال تھا کہ
یہ بچہ کچھ گھنٹے زندہ رہ کر مر جائے گا- مگر ایسا کچھ نہیں ہوا اور میں اب تک زندہ
ہوں- اور ابھی تک میرے وجود کے ساتھ ایک بدبو سے بھرا ہوا کمرہ چل رہا ہے
جس میں سے چیخیں نکل رہی ہیں.....

میں نے سوچا تھا' ایک دن سنیاسی بن جاؤں گا اور اس طرح ہمیشہ کے لئے
کمرے کی بدبو سے نجات پا لوں گا- اسی لئے میں کبھی بھی کمرے کے اندر زیادہ دیر
تک نہیں ٹک سکا- میں بچپن سے ہی اکیلا سڑکوں اور گلیوں میں آوارہ گھومتا اور
گیت گاتا تھا- اور پھر جب گہری رات میں میں اپنی چھت کو گھورتا تو خیال آتا کہ
میں اس گھر کو چھوڑ دوں گا اور بان پر ستھ لے لوں گا یا پھر مان سرودر جھیل پر چلا
جاؤں گا جہاں سے دریا ستلج نکلتا ہے (ستلج میرے گاؤں کے پاس سے بہتا ہے) مگر
میری کمزوری کہ میں ایک کمرے کے سکول میں بیٹھ کر استادوں سے مار کھاتا رہا-
اور جس کمرے میں میں نے استادوں سے مار کھائی' جس کمرے میں میں نے بچپن
گزارا اور جس کمرے میں میں پیدا ہوا' یہ سب میرے اندر ہیا ندر تعمیر ہوتے چلے
گئے اور مجھے جو کمروں کا خوف تھا' وہ بھی بڑھتا گیا- اور اب بھی جب میں بہت اونچی
عمارتیں دیکھتا ہوں' ڈر جاتا ہوں مجھے لگتا ہے جوں جوں ہم چھتیں بناتے ہیں' ہمارا
وجود ہمارے پاس سے بکھرتا جاتا ہے- مجھے لگتا ہے' انسان کنکریٹ میں دبا ہوا ایک
کیڑا ہے اور وہ سیڑھیوں اور کمروں میں رینگتا پھرتا ہے- میرے خیالوں میں ایک
چاؤ اٹھتا ہے کہ جب یہ مصنوعی کمرے منہدم ہو جائیں گے تب آدمی آدمی کے گلے
سے لگ کر سو سکے گا اور پھر انسان کی ہر چیخ پکار میں سب بھائیوال ہوں گے اور پھر
مجھے لوہے بجری سے خوف نہ آئے گا-

لیکن نہیں' ایسا نہیں ہو گا- میرے تصور سے دنیا کا کوئی بھی ارتقا اپنی سمت
نہیں بدلے گا- نیویارک کی فلک بوس عمارتیں گریں گی نہیں' اور نہ کسی گاؤں کے

کوٹھے کی چھت اڑے گی---- اور اس بس کچھ میں میں بھی تو ایک عدد سانس لینے والا جاندار ہوں جو مانسرودر کی بجائے آنند پور کی گدی گلی میں رہ رہا ہوں اور جس کو لوگ پروفیسر صاحب کہتے ہیں۔ اپنے اوپر تنی ہوئی چھت کو میں گھورتا ہوں۔ میری بیوی ہے' بچے ہیں جنہیں چھت کی ضرورت ہے اور کمروں کی بھی۔ ان کے کمرے ہیں۔ میری بیوی کا کمرہ' میرے بچوں کا کمرہ' میرے دوستوں کا کمرہ---- اور ان میں میرا کمرہ کون سا ہے' میں فیصلہ نہیں کر سکتا۔ بس میں ہر کمرے میں "آؤٹ سائیڈر" کی طرح داخل ہوتا ہوں اور اپنا کام پورا کر کے باہر آ جاتا ہوں۔ کوئی کتاب میرے ہاتھ میں ہوتی ہے اور میں شرارتی بچے کی طرح ڈرائینگ روم کی "سمٹری" کو توڑ دیتا ہوں۔ میرے ساتھ سوئی ہوئی بیوی جب صبح کو اٹھتی ہے تو میرے تکئے کے نیچے رضائی کے اندر میگزین دبکے ہوتے ہیں اور فرش پر کاغذ کے ٹکڑے پریشان۔ وہ مجھ سے کسی دوسرے کمرے میں چلے جانے کے لئے کہتی ہے تو میرے ساتھ کتنا کچھ اس کمرے میں پہنچ جاتا ہے۔ اور سب کچھ کو سمبھالنے میں اس کو آدھا دن کام کرنا پڑتا ہے---- میرا کوٹ' میری چپلوں کے ساتھ ساتھ آئے ہوئے چائے کے خالی پیالے.....

میرے لکھنے کے لئے کوئی جگہ معین نہیں ہے۔ جیسے میرا کمرہ کوئی نہیں ہے۔ کمرے کے اندر' ڈرائینگ روم میں' دوکان پر' کافی ہاؤس میں یا کالج کے لان میں بیٹھ کر میں سوچتا رہتا ہوں اور سوچے ہی جاتا ہوں۔ لکھنے سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کسی طرح لکھے بنا ہی کام چل جائے۔ میں بس اپنی روح کے ساتھ برسرپیکار رہوں جو کہ تاروں سے بھر سے لے کر جھیلوں سے گھرے پہاڑوں میں کہیں کھو گئی ہے اور کسی بھی دیوار کو قبول نہیں کرتی۔ وہ ڈرتی ہے تب جب کسی لوہے کی بھٹی میں گرم لوہے پر ہتھوڑا پڑتا ہے اور میرا وجود ہوا میں تیرتا دکھائی دیتا ہے۔ میں نہ جانے کس چیز کو پڑنے کے لئے مکان کی چھت پر گھومتا ہوں اور پہاڑ کے پیچھے ڈوب رہے سورج سے باتیں کرتا ہوں اور کسی آواز کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور جب وہ آواز میری پکڑ میں نہیں آتی تو میں ٹکٹکی لگا کر سناٹے میں

گھورتا رہتا ہوں۔ اور تب مجھے لگتا ہے کہ میں ضرور ایک دن بھاگ جاؤں گا اور وہ کمرہ جس کی چابیاں کب کی گم ہیں اور جو ایک گنبد بن کر آج کل میرے ارد گرد پھیل رہا ہے، میں اس کی تلاش میں نکل بھاگوں گا۔ مگر کہاں ہے وہ کمرہ؟ میری بھاگنے کی سمت کون سی ہو گی؟ اور جب میں اس چاروں طرف نگاہ دوڑاتا ہوں، میرے تخیل کی پرواز سامنے کے گھر کے اندر تھرتھراتی لڑکی کی آواز میں گم ہو جاتی ہے۔ چاہنے لگتا ہوں کہ وہ ستار پر الاپ کرے اور میری دوست لڑکی کوئی جملہ سنائے تو میں نوٹ کرتا جاؤں اور بس کمرہ پھیلنے لگے۔ رات کی گہرائی میں بیٹھ کر سوچتا جاؤں، اپنے آپ سے باتیں کرتا جاؤں۔ اور سورج نکلنے کی آواز، دھند کا راگ اور کھیتوں کی خوشبو کو الفاظ میں تبدیل کر دوں۔ بس کے اڈے کی آوازیں، ریل کے پل پر بنتی مٹی پر چھائیوں کو پکڑ لوں اور پھر ایک کمرہ بناؤں.....

ایک وہ کمرہ جس میں میری روح نہ مرے، جس میں دنیا بھر کی آوازیں تیرتی ہوئی اندر جا سکیں، جس میں سے سمندر کا راگ، اور ہوا کی مہک اور بادلوں کا اندھیرا میرے ساتھ باتیں کر سکیں.....

کبھی سوچا تھا، اک جھونپڑی بناؤں گا جس میں کچھ کتابیں، کچھ کاغذ اور قلم دوات ہو گی اور میں ساری زندگی میں بس ایک کتاب لکھوں گا اور خاموش مر جاؤں گا۔ مگر نہیں، میں یہ بھی نہیں کر سکتا اور نہ ہی کر سکا ہوں۔ میرے اندر کا ادنیٰ انسان مجھے خاموش نہیں رہنے دیتا۔ میں تعریف چاہتا ہوں، میں بدگوئی چاہتا ہوں..... اور اپنا نام ریت کی دیواروں پر لکھا دیکھ کر میں کئی بار خوش بھی ہوتا ہوں۔ اور اس طرح اب میں جس سمت میں پہنچ گیا ہوں، مجھے ایک کمرے کی ضرورت ہے، ایک کمرہ جو بستیوں سے دور نہیں بلکہ شہر کے عین بیچوں بیچ ہو، جس کی کھڑکیوں سے سارے شہر کی بدبو اندر جاتی رہے، سورج کے ٹکڑے کرچیں بن کر پیروں کے نیچے دبتے رہیں اور ہوا کا ہر جھونکا سینکڑوں کاغذوں کے ٹکڑے اندر بکھیر دے۔ کمرے میں دروازے نہ ہوں، پردے نہ ہوں جو کہ بند ہو سکیں، جو کہ اڑ سکیں۔ چھت میں سوراخ ہوں جن سے پرندے اندر آ سکیں اور مجھ سے باتیں کر

سکیں۔ سوراخوں کے راستے سے جھانکتی ہوئی چاندنی کو کہیں چھپا کر رکھ سکوں۔ کمرے کی دیواروں پر ڈالی' مائیکل انجیلو اور پکاسو کی پینٹنگ ہوں' ایک طرف سٹوو پر چائے بن رہی ہو' کتابوں کے ڈھیر ہوں۔ کہیں کونے میں دنیا بھر کے موسیقاروں کے ریکارڈ ہوں۔ نیچے صرف پتھر ہوں اور ان پر بیٹھا میں پڑھ رہا ہوؤں' سوچ رہا ہوؤں' سو رہا ہوؤں..... یا موسیقی کی دھن پر رقصاں ہوؤں۔ جی چاہتا ہے' اس کی دراڑوں سے کوئی جھانک رہا ہو' وہ جس کی کہ مجھے جستجو ہے اور جو کبھی مجھ سے یہ کہہ سکے' میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ جب تمہارے منہ سے زہر نکل رہا تھا اور اس کو تم نے آب حیات کہہ کر لوگوں میں بانٹا تھا۔۔۔۔ میرے کمرے کی دیواروں کے رنگ گہرے سیاہ اور سرخ ہوں اور ہر دیوار کو الگ الگ چہروں سے آراستہ کر رکھا ہو۔ اس میں بابا آدم سے لے کر اب تک کے انسان کی سبھی مصور کی ہوں۔ اس میں نہ کچھ بند ہو اور نہ ہی کھلا۔ اس کے آگے لکھا ہو۔۔۔۔ اپنے پیراہن باہر اتار کر آؤ! آپ یہاں سے جو چیز چاہیں' چرا کر لے جا سکتے ہیں۔ مہربانی کر کے گداگر مت بنئے گا!"۔۔۔۔ اور میرے کمرے کے ہر سوراخ کے آگے شیشہ لگا ہو جس میں سے اندر آنے والا ہر آدمی پہلے اپنی صورت دیکھ سکے۔ لیکن کیا ایسا ہو سکے گا' امرتا؟ شائد نہیں!۔۔۔۔ میرے کمرے میں تو سامنے یہ گورو صاحبان کی تصویریں لگی ہیں' صوفے پڑے ہیں' کیلنڈر ٹنگے ہیں جن پر تاریخیں مندرج ہیں' مگر جن کی طرف میں نے کبھی نظر نہیں کی۔ پائیدان پڑے ہیں جن پر آپ کو پیر صاف کرنے پڑتے ہیں' گھڑی رکھی ہے جو مجھے چھیلتی رہتی ہے' ہر پل' اپنی ٹک ٹک سے' اور دیواروں کا رنگ سبز ہے۔ میرے خاندان کے لوگوں کی تصاویر ہیں' اور میں لکھ رہا ہوں۔ میری بیوی چائے کے لئے پوچھ کر گئی ہے' اور اب وہ بچوں کے ساتھ سو گئی ہے۔ میں جاگ رہا ہوں اور..... اور وہ کمرہ بھی میرے ساتھ جاگ رہا ہے جو کہ میں نے اپنی پیدائش کے وقت کی پہلی چیخ کے ساتھ دیکھا تھا جب میں نے پہلی بار دنیا میں اپنی آنکھ کھولی تھی' اور جو کہ اب ہر دیوار سے الگ ہو کر میری اس آرزو کو مشتعل کر رہا ہے اور مجھ سے کہے جا رہا ہے۔ زمین کے اندر اک قبر ایسا کمرہ بنوا لو'

اک کمرہ آسمان میں بنوا لو' ایک شہر کے ٹھیک بیچوں بیچ اور ایک شہر کی بھیانک آوازوں کے اندر۔ اور پھر ان کی زیارت کرو۔ اپنی ہر زندگی بدلتے وقت کمرہ بھی بدل لیا کرو۔ مگر کہاں؟ اور کیسے؟---- میرا کمرہ مجھ سے کھو گیا ہے دوستو!

دیویندر دیدار 1946

لفظ "میرا" سے ہر آدمی کو عجیب سے لگاؤ ہوتا ہے' اور "میرا کمرہ" واقعی ایک حسرت کا دوسرا نام ہے' اور پھر مصنف قسم کے لوگوں کے لئے "تنہائی" زندگی کی طرح ضروری ہوتی ہے۔

سب سے پہلے اپنے جس کمرے کا خیال آتا ہے' اس کو "میرا" کہنا مناسب نہیں ہے کیونکہ اس وقت "میرا" لفظ کے معانی سے میں انجان تھا۔ "کہنا" تو میرا ہو سکتا تھا مگر گھر یا کمرہ "ہمارا" ہی ہوتا تھا۔ اس تیرہ کمروں والے تین منزلہ مکان میں سے صندوقوں والی کوٹھری کا ہی خیال آتا ہے۔ کہتے ہیں' پہلے اس میں چار صندوق اور ایک لوہے کا بکس ہوتا تھا اور اس سے زیادہ اس میں اور کچھ نہیں رکھا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کا نام صندوقوں والی کوٹھری پڑا ہوا تھا۔ مگر جہاں تک مجھے یاد ہے' اس وقت اس میں تین صندوق ہوا کرتے تھے' ایک میری پڑ دادی جی کا' ایک دادی جی کا ایک اور ایک میری ماں کا۔ دروازے کے ایک دم سامنے ایک کافی بڑا نواڑی پلنگ پڑا رہتا تھا جس کے بڑے بڑے پایوں میں پاؤں اڑا کر اس پر چڑھنا مجھے ابھی تک یاد ہے۔ بس' یہی کمرہ ہمارا تھا جس کے اندر اوروں کے صندوق ہونے کے باعث ہم اس پر تالہ نہیں لگا سکتے تھے۔ میری بوا کے بیاہ کے بعد ایک صندوق اس میں سے نکال لیا گیا اور کمرہ اور کھلا ہو گیا۔

اس تیرہ کمروں والے مکان میں ہم چار کنبے بالکل شہریوں کی طرح رہ رہے تھے۔ میرے تاؤ جی' چچا جی' ہم اور ہم سب کے بیچ والد صاحب کے چچا جان!۔۔۔۔ ایک کمرہ جس میں اکثر اناج رکھا جاتا تھا' اناج والا تھا' ایک اپلوں کا'

ایک بَوسے کا' ایک ہمارے صندوقوں کا۔ ایک بلیوں والا کمرہ تھا جس میں کسی زمانے میں بلی نے بچے دیئے تھے۔ یہ چچا جی کے کنبے کے پاس تھا۔ اوپر کے دو چوباروں میں سے ایک تاؤ جی کا اور دوسرے چوبارے اور ساتھ کے چھوٹے کمرے میں ہم سب کے خاندان شریک رہتے تھے جنہوں نے نیچے بھی دو چار کمروں کو صرف آدھی ملکیت جتانے کے لئے تالے لگائے ہوئے تھے۔ تیسری منزل والا چوبارہ جسے سب "ممٹی" کہتے تھے' وہاں ایک پٹواری اپنے کنبے کے ساتھ رہتا تھا جس کو کمرہ ہی مفت نہیں دیا گیا تھا بلکہ دودھ' ایندھن اور چھٹ پٹ بھی ہمارے گھروں کے ذمے تھا۔

سب نئے نئے الگ ہوئے تھے مگر کھیتی ابھی مشترکہ تھی۔ اوپر رہنے والوں کے لئے رسوئی کی کوئی تکلیف نہیں تھی' مگر نیچے کا حصہ چونکہ سارا مسقف تھا' بس گھر کے درمیانی حصہ میں ایک جنگلہ تھا جو نیچے روشنی پہنچانے کا واحد ذریعہ تھا' اس لئے ہم دونوں نیچے والے گھروں کی رسوئی کی بہت دقت تھی۔ بھوسے والی کوٹھری کو جاتے ہوئے ایک برآمدہ نما کمرہ تھا' جہاں ہم دونو گھروں کی رسوئیاں تھیں---- ہماری ذرا جنگلے کے نیچے اور چچا جی کی اندر کی طرف جہاں آگ بعد میں جلتی تھی اور ہمارے گھر میں دھواں پہلے بھر جاتا تھا اور ہم بچے کھانستے ہوئے باہر کو بھاگتے تھے۔ جاڑا تو کسی نہ کسی طرح دھوئیں دھنگار میں بتی جاتا مگر گرمیوں میں بند چھت کے نیچے رسوئی کرنے اور سونے کا مسئلہ شہر کی تنگ گلیوں سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کے پریشان کن ہوتا۔ گاؤں کی فراخی اور وسعت اس گھر میں ایک خواب تھی۔ رات کو ہم رت جگا کرنے والی ایک بزرگ مائی نامو کے صحن میں سوتے تھے جہاں بارش آ جانے پر ہم کو سینتالیس کے دنگوں والی آپا دھاپی پڑ جاتی---- بہت بار کسی بات کو لے کر تو تو' میں میں ہونے کی وجہ سے اس قلعہ کی بجائے الگ الگ گھر بنانے کی کھسر پھسر میں نے سنی تھی---- مگر پھر امن اور خاموشی چھا جاتی کیونکہ گھر کی مالی حالت اب ویسی نہیں تھی جو اس مکان کے بننے کے وقت تھی---- میں دسویں پاس کر کے "اپنے کمرے" کی جستجو میں ایر فورس میں بھرتی ہو گیا۔

مگر وہاں پہنچ کر حالات گھر سے بھی زیادہ دشواری بھرے معلوم ہوئے۔ میں اپنے بیچ کا سب سے پہلا ٹرینی تھا اور میرے ساتھ تھا شملہ سے ہی بھرتی ہو کر آیا ہوا دھرم پال ڈوگرہ---- پہلے تو شملہ سے بنگلور تک کا سفر بو کھلا دیتا تھا' خاص کر ایسے آدمی کو جس نے امرتسر بھی اماوس کے بہانہ سے دیکھا ہو۔ بھارت کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کا سفر ایسا لگتا تھا جیسے ہم گاڑی میں ہی پیدا ہوئے تھے اور گاڑی میں ہی مرکھپ جائیں گے۔

خیر' بنگلور پہنچے تو ایک لمبی سی بارک میں ہمارے اٹیچی و بستر رکھوا کر ہمیں ؛ نیسیشیل کٹ دینے کے لئے لائن میں کھڑا کر دیا گیا---- نیلی نیکر' نیلی جرسی' گرم نیلی جرابیں اور بڑے فوجی بوٹوں کے ساتھ مگ' پلیٹ اور خدا کے چھوٹے بھائی ایسا چمچہ!---- گھر سے جہاز اڑانے کے سپنے لے کر آئے تھے اور یہاں کارٹون بن کر بیٹھ گئے تھے۔ دن بدن وہ بارک بھرنے لگی۔ ملک کے سارے ریکروٹ منٹ سینٹروں سے دو دو چار چار لڑکے آتے گئے اور اس کمرے میں ہم قریب پچاس ٹرینی اکھٹے ہو گئے۔ سکولوں سے نکلے ہوئے سترہ اٹھارہ سال کے لڑکے بے ڈھب سے حلیئے میں حیران سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے۔ ایک کی بولی دوسرے کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ سب کے چہروں پر اک عجیب سی اوداسی لپی ہوئی تھی اور کئی مجھ ایسے تو گھر کی یاد سے سکنے تک پہنچ گئے تھے۔

پھر ٹریننگ شروع ہوئی۔ جس پڑھائی کے ڈر کے مارے بھرتی ہوئے تھے' وہی پڑھائی اب دگنی ہو کر سامنے پھیلی پڑی تھی۔ کوئی نو مہینے میں تین بارکیں بدل کر' کبھی ہسپتال لوہے کی چارپائیوں اور کبھی زمین پر براجمان ہو کر ہم "کنواری" سے "بیاہتا" ہو گئے یعنی پورے "فل فلیجڈ" ائرمین بن گئے۔ اک عجیب سی قید سے آزاد ہونے کا احساس لئے "اپنے کمرے" کی تلاش میں ناگپور پہنچ گئے۔ "مینٹ نینس کمانڈ" تب کانپور سے بدل کر ناگپور آیا ہی تھا اور نئی بارکیں بننے والی تھیں۔ رہنے کی اتنی تنگی تھی کہ چھوٹے چھوٹے کمروں میں مویشیوں کی طرح آدمی بھرے ہوئے تھے یا چار چار' پانچ پانچ کو ایک ایک تنبو میں رکھا گیا تھا۔ ناگپور کی استوائی

گرمی اور اوپر سے ریلوے سٹیشن کے ایک دم سامنے ہمارا کیمپ' چند دن میں یہ کمرہ تو دور خدا کو بھولنے کی نوبت آگئی تھی۔

ایک دن بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی۔ میرا قیام تین دیگر ساتھیوں کے ساتھ ایک تنبو میں تھا۔ اس دن اتنی بارش ہوئی' اتنی آندھی آئی کہ لگتا تھا ہمارے تنبوؤں کے ساتھ ساتھ یہ زمین بھی سالم نہ بچے گی۔ ہم تین جنے اس خیمے میں سکڑے پڑے تھے۔۔۔۔ ایک مراٹھی لڑکا ایم' ایم' سونا جی ایک بنگالی آر' کے' ڈی' اور میں۔۔۔۔ ہم تینوں ایک ساتھ بنگلور سے ٹریننگ کر کے آئے تھے۔ چوتھا لڑکا دھرم بیر ڈیوٹی پر تھا۔ چاروں طرف ایسا جھکڑ تھا کہ ہم نہ اپنے بستر بچا سکے نہ کپڑوں کے ٹرنک اور اٹیچی۔ میرے ذہن میں اس وقت جو بات آئی' وہ آج تک نہیں بھولی ہے کہ بھرتی ہونے کے وقت ہم جیسوں کا ذہنی معیار نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ نہ ہم کو یہ پتہ ہوتا ہے کہ ہم کہاں اور کیوں بھرتی ہو رہے ہیں' بس' سپنوں کے گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں۔ اگر ایئر فورس میں کام نہ بنتا تو فوج میں بھرتی ہو جاتے اور ہماری عمر ایسے خیموں میں جنگلوں ویرانوں میں بھٹکتے گزرتی اور ٹرینچیں کھودتے کھودتے ہم اپنے اپنے کمرے کھو جتے۔ ملک کی خدمت کی بات محض کتابی یا سرکاری وزراء اور سیاسی لیڈروں کی نعرہ بازی ہے۔ کون مائی کا لال ملک کی خاطر بھرتی ہوتا ہے؟ جب اور کہیں کام نہیں بنتا تو ادھر منہ کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔ اس وقت مجھے گھر کی اتنی یاد آئی کہ دل کرتا تھا' زور زور سے روئے جاؤں۔

گھر گئے ایک سال ہونے کو آیا۔ بنگلور میں ہم سے وعدہ کیا گیا تھا کہ پیرنٹ یونٹ کے جاتے ہی آپ کو چھٹی مل جائے گی۔ مگر یہاں پہنچ کر پتہ لگا کہ وہاں کا خدا اور یہاں کا خدا بھائی بھائی نہیں ہیں۔ آخر بڑی منت سماجت اور تھوڑی سی اشک شوئی کے بعد ایک مہینے کی چھٹی منظور ہو گئی۔ مگر نصیب نے ساتھ نہیں دیا۔۔۔۔ چھ ستمبر کو پاکستان کے ساتھ جنگ چھڑ گئی۔ ناگپور کو جنگ سے خطرہ نہ تھا مگر میرا گاؤں سرحد سے صرف چھ میل دور تھا' اور اس حالت میں چھٹی سے انکار.....

خیر' بات کمرے سے دور چلی گئی ہے۔ چھیاسٹھ کے شروع میں ہم نے نئے

بنے "وایو سینا نگر" میں قدم رکھا۔ یہاں کی اور بنگلور کی بیرکوں میں صرف اتنا فرق تھا کہ یہاں لکڑی کی چارپائیاں تھیں اور ساتھ میں ایک ایک کبرڈ بھی ملا تھا باقی وہی مچھردانی کی حد تک محدود کمرہ جو کسی طور بھی "آپ کا اپنا" نہیں تھا۔ سو سکنے سے زیادہ وہاں کسی سے کوئی پردہ نہیں تھا۔

بہت بڑی بیٹھک تھی جسے آٹھ حصوں میں بانٹا ہوا تھا۔ چار نیچے اور چار اوپر کی منزل پر۔ ہر کمرے میں ہر تئیس چوبیس ہوائی جوان "رین بسیرا" کرتے تھے۔ بڑا عجیب سا ماحول ہوتا تھا۔ وہاں یہ ضروری نہیں تھا کہ آپ کے دونو طرف رہنے والے ساتھی آپ کے ہم خیال ہوں۔ چارپائیوں کا فاصلہ بھلے یہ انگلیوں میں ماپا جاتا تھا مگر خیالات و عادات کا فاصلہ میلوں تک کا نہیں، عمروں تک کا ہوتا تھا۔ کئی بار یہ دو ہاتھ کے فاصلہ پر رہنے والے حضرات سالوں تک ایک دوسرے سے ہم کلام نہ ہوتے تھے۔

شام کو اگر کبھی کوئی پوری بیرک کا چکر لگاتا تو اسے اک عجیب منظر دیکھنے کو ملتا---- تیواڑی جی کسرت کر رہے ہیں تو توترپاٹھی جی گیتا پڑھنے میں مصروف ہیں، ریڈی الیکٹرک گٹار سے دھن نکالتے ہیں تو دواکرن شراب کے جام جمع کرنے میں لگے ہیں۔ موہن جیت گنگا لئے بیٹھا ہے تو رندھاوا صاحب باجوہ صاحب سے گالی گلوچ میں الجھے ہیں۔ مصرا، کتھوریا، شرما اور جوسی تاش میں گم ہیں تو ایسی ہی ایک اور ٹولی "کانفیڈ -نشل ایڈوائزر" اور "آزاد لوگ" کے گرد جمع ہے۔ اور ایسے بو قلموں ماحول میں مجھ ایسا کوئی خیال پرست افسانہ یا نظم پر طبع آزمائی کر رہا ہوتا۔

کالج ہوسٹلوں کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے مگر وہاں تعلیم کا سہم تلوار کی طرح ہر وقت سر کے اوپر لٹکتا رہتا ہے، ساتھ ہی ہر مہینے گھر والوں سے پیسے منگوانے کے لئے بہانے گڑنے پڑتے ہیں۔ مگر یہاں سب نے اپنی اپنی فراست کے مطابق اپنا نشانہ سر کر لیا ہوتا ہے۔ اب بنا آنکس کے ہاتھ کی طرح آزاد تھے۔ ایسے ماحول میں میرا کمرے کا خواب بھی پھیکا پڑنے لگا۔ یہاں ناگ پور کے بدنام بازار "گنگا جمنا" اسپتالکی دل پھینک نرسوں سے پیچیدار تعلقات، ایل، اے، ڈی اور میڈیکل

ہوسٹل کے چکر ہی بہتوں کے لئے بچتے تھے۔

میرے ذہن میں اگا ہوا ادیب میری ہوش سے پہلے کا ہے۔ مگر آج تک اس کو وہ ماحول، وہ کمرہ نصیب نہیں ہوا جہاں اس کو پروان چڑھانے کے لئے کچھ کیا جا سکتا۔ ناگپور کے لکھنے کے جنون کے دنوں میں "میرا کمرہ" جنگل کے گھرا اندر ایک برگد کا پیڑ تھا۔

شادی کے بعد امرت سر کے کمرے کا مسئلہ عام کرایہ داری کے قسم کا تھا۔ اس کے بعد باگ ڈوگرے کے ریلوے کوارٹروں میں ایک کمرہ اور بعد میں اپنے ڈیپارٹمنٹ کے کوارٹر میں ایک کمرہ لے کر رہنے کا تجربہ دوزخ سے ہو کر لوٹنے کے برابر تھا۔ ایک ہی کمرے میں "سب کچھ" پیپے اور ڈبے کھڑے کر کے بنایا ہوا باورچی خانہ اور ٹرنک ایک سیدھ میں رکھ کر بنایا ہوا صوفہ---- اسی کمرہ میں مہمان، اسی میں سرہانے کے پاس کتاب رکھے ہوئے مصنف! جیسے سارے خاندان کو قید کی سزا دی گئی ہو۔ ان کمروں نے مجھے کئی افسانے دیئے، یہاں تک کہ میرا ناول "کالی مرچ کی بیل" بھی انہی کمروں کی دین ہے!

یہیں مجھے وہ کمرہ نصیب ہوا جسے فوجی زبان میں "اپنا کوارٹر" کہتے ہیں، دو کمروں کا سیٹ، ساتھ میں رسوئی اور غسل خانہ۔ کوارٹر کے اندر پاؤں رکھتے ہی میرے اندر کے ادیب نے بڑی تسکین سی محسوس کی کہ ایک کمرے میں بیوی اور بچے رہیں گے اور ایک کمرہ مصنف کا "اپنا" ہو گا۔ لیکن اگلے ہی دن اس تسکین کی حدیں سکڑنے لگیں۔ کوارٹر میں عام چلن یہ تھا کہ ایک کمرہ غیر قانونی طور پر اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ کے کسی کارکن کو کرائے پر دیدیا جاتا تھا جیسے کہ کوارٹر ملنے سے قبل رہتا آیا تھا۔ سو ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے لوگ اپنا "حق" سمجھتے ہوئے ایک کمرہ ہتھیانے پر تلے ہوئے تھے۔ کئی نزدیکی دوستوں کو ناراض کرنے کے بعد بھی جب وقت بے وقت دروازہ کھٹکھٹائے جانے سے نہ رکا تو مجھے گھٹنے ٹیک دینے پڑے۔ ساتھ ہی بیوی بھی آتے ہوئے تیس پینتیس روپوں کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے بقول میں نے مصنف بن کر کون سا جہان جیت لیا تھا۔ کہانی چھاپنے والے پیسے

تو دور، پرچہ تک نہیں بھیجتے۔ جو دو کتابیں چھپوائی ہیں، وہ بھی پیسے دے کر.....! اور ہم پھر ایک کمرے تک محدود ہو گئے۔ اسی طرح بنجاروں ایسی زندگی کچھ سال آگرہ میں بتا کر پندرہ برس کی قید پوری کی اور اب اپنے جدی مکان کو لوٹ آیا ہوں کہ شائد یہاں کوئی کمرہ اپنا بن جائے۔

ملازمت چھوڑنے سے پہلے میں اور دیویندر، میری بیوی، امرتا جی سے ملنے گئے تو امرتا جی کی سب سے پہلی بات یہی تھی "دیویندر! دیدار صاحب کو نوکری مت چھوڑنے دینا۔ ماہ کے ماہ تنخواہ آ جاتی ہے، گھر کی روٹی چلتی ہے۔ ادیب لوگ بیوپار نہیں کر سکتے!" مگر اس وقت مجھ پر میری کہانی "موسی کی بیٹی" کا کردار جیون سنگھ سوار تھا اور میں کمرے کا ہی نہیں، ایک گھر کا مالک بننے والا تھا۔

مکان میں اب تیرہ کے بجائے پانچ کمرے ہیں۔ کنبہ بھی بڑا نہیں ہے، کوئی بیر حسد نہیں ہے، پھر بھی مجھے ان میں سے کوئی کمرہ اپنا نہیں لگتا۔ اوپر والا چوبارہ میں نے اپنے ذوق کے مطابق آراستہ کیا ہے، باہر سے آنے والا حیران بھی ہوتا ہے دیکھ کر، پھر بھی ارد گرد کا شور، کسی کا بے جھجک کمرے میں آ جانا فضول سے لوگوں کا گھنٹوں چلنے والا، بے سروپا باتوں کا سلسلہ..... مجھے اس کمرے کو "اپنا" کہنے سے روکتے ہیں..... اور میں اس کمرے کی آرزو میں کھو جاتا ہوں جس میں بڑی سی میز ہو لکھنے کی، اور خدا تک کو بھی میرے کمرے میں آنے کی اجازت نہ ہو.....!

پریم گورکھی 1947

میرا کمرہ...... میرا کمرہ...... میرا کمرہ! ایک ٹنکار ہے جو سائیں سائیں کرتے میرے کانوں سے دور اٹکی کھڑی تھر تھرا رہی ہے' ایک ہوا ہے جو میری آنکھوں کی پتلیوں سے سرک کر میرے پوروں پر آ بیٹھتی ہے' چتکبری تتلی کی طرح اور میرا خود زمین میں دبا ہوا ابھی خلاء میں اڑتا ہوا' بے تحاشہ ہاتھ مارتا ان لمحوں کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے جو میری یادوں کی منڈیوں پر موروں کی طرح بیٹھے ہوئے پر پھڑپھڑا رہے ہیں...... پرواز بھرتے ہیں اور اڑ اڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

برسوں کی چھوٹی سی گٹھڑی آج تنکا تنکا ہو کر بکھر گئی ہے...... آج جب سپنے نہ حقیقت بن سکے ہیں اور نہ اقراروں کے پھول پھلوں میں بدل سکے ہیں۔ اور میرا تخیل اس کمرے کی شکل کو خاکہ بند کرتے کرتے بوڑھا ہوتا جا رہا ہے۔ جہاں چار اینٹوں کی اوٹ ہوتی ہے مگر اس کے اوپر دھوئیں کی ایک لکیر پھرتی ہوئی سیاہی میں بدل جاتی ہے---- اور سیاہی میں کہیں۔ میرا وجود موجود ہے۔

برسوں کی اس چھوٹی سی گٹھڑی بکھرے ہوئے تنکوں میں سے کچھ ایک کو آوارہ مویشی منہ مار گئے' کچھ ایک کو پرندوں نے گھونسلوں میں جا ٹکایا اور کچھ ایک ہوا میں اڑتے منڈلاتے گندے جوہڑوں میں جا گرے---- اور ان برسوں کی داستان کو سرے سے بھلا دینا دل کو نہیں بھاتا۔ اور برس بھی وہ جب لکھنے کے میدان میں ابھی گیہوں کی بالیاں ہی چھینکی گئی تھیں---- ابھی تو آگے سفر پڑا تھا۔ انبار لگنے تھے اڑانیں ہونا تھیں اور پھر کہیں دانوں کا منہ دیکھنا تھا---- اور لکھنے کے وہ دن جب سکول کی تعلیم کو بیچ ہی میں چھوڑ کر بالناتھ کے ٹیلے کا زائر بننا چاہا

تھا۔ لیکن والد نے صابن فیکٹری کے مالک کے سپرد کر دیا تھا۔ چھوٹے سے کمرے میں راتوں کو پڑھا کرتا اور مالم نہیں' کیا کچھ لکھتا رہتا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں صابون تولنے کے چھوٹے چھوٹے ترازو پڑے رہتے تھے' بیروزے ے پیپے' سلیکٹ اور تیار صابون کے بڑے بڑے پیک کرنے والے کاغذ اور دھول سے سنے ہوئے تھیلے اور مچھروں کے ڈھیر اور جالے سے اٹی ہوئی چھت۔ پانچ مہینے وہاں کام کے دوران میں میں نے بہت سے ناول پڑھ ڈالے تھے' جن میں بیشتر سراغ رسانی کے تھے اور جو تب مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ خاص کر فرانسیسی سے ترجمہ شدہ آرسین لوپن کے کارنامے! اور میں فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہاں بھٹی جھونکتے ہوئے میں نے اپنی قلم سے جو پہلی تخلیق کی' وہ ایک ایکانگی ناٹک تھا۔ ایک ایکٹ کا ڈرامہ---- وہی میرا پہلا لکھنے کا کمرہ تھا' بے حد غلیظ جس سے مجھے نفرت بھی تھی اور انس بھی! اور وہاں سے جلد ہی چھٹکارا پا کر میں نانا کے پاس گاؤں کو چلا گیا تھا۔

نانا کے گھر میں کیا تھا---- دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے گھڑے اور ہانڈیاں جو دالوں' اناجوں' گڑ اور شکر سے بھری تھیں۔ یا پھر بڑے دالان میں گاڑی ہوئی کھڈی' لمبی سی سوت کی تانی..... صحن میں پھیلا ہی کی ٹھنڈی چھاؤں اور گاؤں کے پیروں میں بہتی ہوئی ندی---- ان دنوں کا جنت پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ یہ سب کچھ میرے لئے خوشگوار تھا مگر وہاں کتابیں نہیں تھیں۔ نانا نانی کا پیار تھا اور بیوہ موسی کی گالیاں تھیں۔ شام ڈھلتے چھوٹی سی کھرپی لے کر نانا کے ساتھ گھاس کھودنے کے لئے جاتا اور ندی کی ریت میں سے گھونگھے اور سیپیاں جمع کر لاتا---- یہ سب کچھ میرے لئے اک کمرے کا ہی حصہ تھے' چھت بھی اور نرم فرش بھی۔

اور پھر ہر گھناؤنے دن جیب ایسا لگتا تھا کہ جہاں پاؤں دھروں گا' زمین پھٹ جائے گی' دیواریں ڈھیر ہو جائیں گی ان دنوں میں میں جو بھی لکھتا تھا' اس سے مجھے خود خوف لگتا تھا۔ اور یہ کچھ میں یہاں لکھتا تھا' اس کے بارے میں یاد کرنا آج اچھا لگتا ہے اور ان دنوں کی یاد آتے ہی آنکھیں مند جاتی ہیں---- ایک مختصر سی کچی

کوٹھڑی، چھت سے آٹھوں پہر جھڑتی ہوئی مٹی اور مویشیوں کا گوہا کوڑا---- کچی دیواروں کے کونوں میں چوہوں کے ان گنت بل تھے جہاں کبھی کبھی سانپ بھی آکر ٹک جاتے تھے۔ مچھروں اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ، بنا کواڑ کی ایک الماری تھی جس میں پچیس تیس کتابیں تھیں یا ان کے نیچے چھپی ہوئی ٹڈیاں۔ ایک کونے میں کرپان، گنڈاسا اور لاٹھیاں رکھی رہتی تھیں، کھرپے، کھرپیوں اور درانتیوں کے بیچ والا کا پیتل کا حقہ۔ آدھے حصے میں بھینس بندھتی تھی جس کی جگہ کبھی گائے لے لیتی تھی، کبھی بچھڑے۔ دیوار کے ساتھ چراغ والے طاق کے نیچے میں چارپائی بچھاتا تھا---- دروازے کے آگے لٹکتے ہوئے ٹاٹ میں اتنا بوتا نہ تھا کہ باہر سے آنے والے تیز، سرد ہوا کے جھونکوں کی مزاحمت کر سکتا اور چار گھڑیاں چین سے سو سکتا۔ اسی حالت میں لکھنا پڑھنا ہی سود مند کام تھا۔ دن چڑھنے تک بیٹھا رہتا تھا، اک الگ سی دنیا میں کھویا ہوا۔ مویشیوں کے خراٹے اور بدبو، گوبر کی سڑاند اور پیشاب کی تیکھی، تیزابی باس، مجھے "اپنے کمرے" کا یہ کچھ کبھی بھی عجیب نہیں لگا تھا۔ اس سب کو اگر میں نفرت بھی کرتا تو کیوں؟ اپنے یہ گھر سے؟---- کلی یار دی سورگ وا جھوٹہ، اک لاواں محلاں نوں---- مرنے والا چچا میاں کہا کرتا تھا۔

اور اس چھوٹی سی کوٹھڑی کے اندر لکھنے کے علاوہ جو کار گزاری چلتی تھی، اس کی بات کہتے ہی بنتی ہے۔ دو چار کہانیاں ناگ منی میں چھپ چکی تھیں۔ امرتا کا بڑا حوصلہ افزا خط آیا تھا---- "میں باہر کے ملک سفر پر جا رہی ہوں۔ میرے لوٹنے تک ناولٹ لکھ کر رکھنا"---- اور انہی دنوں عجیب طرح کی اپنائی ہوئی عادتوں کو میں چھوڑ رہا تھا۔ وہ رات بڑی بھیانک تھی۔ میں ناولٹ "بوڑھی رات اور سورج" کا آخری حصہ لکھ رہا تھا جس میں ہیرو ظلم کا شکار ہوتا ہے اور بدلہ لینے کے لئے ہتھیار لے کر گھر سے نکل پڑتا ہے۔ میں دئے کی لو میں ننگے بدن بیٹھا اپنے کردار میں کھویا ہوا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کونے میں بندھی بھینس موتر سے بھری ہوئی مونچھ سے مجھ پر اور اپنے ارد گرد چھڑکاؤ کر رہی ہے۔ رات آدھی بیت چکی تھی۔ تبھی ٹاٹ اٹھا کر کوئی اندر آیا۔ اپنا یار بھالو تھا---- "آج موقعہ ہے

بھئی'..... وہ نقلیں دیکھنے لالی گیا ہے..... نہر پر گھیر لیں اسے..... اٹھ چل!" وہ کھڑے کھڑے ہی بول گیا۔ گاؤں سے ہی ایک اور ہم عمر کو گھیرنے کی بات وہ کر رہا تھا جس نے مہینہ بھر پہلے بھالو کے چھوٹے بھائی کو شہر میں گھیر کر پیٹا تھا۔ مگر میں اپنے ارد گرد اگ آئے کنول پھولوں سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بھالو کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ وہ جھنجھلا کر وقت بے وقت پر نبھائے ساتھ کے طعنے دینے لگا اور پھر تڑپ کر اپنی بغل سے ڈیڑھ فٹ لمبا چھرا نکال کر میرے پیروں کے پاس دے مارا اور غصے سے پاؤں ٹپکتا باہر نکل گیا۔ سرد ہوا کے تیز فراٹے نے جلتے ہوئے دیئے کو بجھا دینا چاہا مگر میں نے ہاتھوں کی ہی نہیں' پورے بدن کی اوٹ دے کر اسے جلتا رکھ لیا۔۔۔۔ اور یہی ایک کوٹھڑی ہے جو بہت عرصہ تک میرا "لکھنے کا کمرہ" رہی ہے اور جہاں میرا بہت کچھ سمبھال کر رکھا ہوا ہے۔

جب میرے اندر کے افکار نے اک موڑ لیا تب پھوٹتی ہوئی کونپل کو وقت کے دانا لوگ دکھائی دیئے۔ جسونت سنگھ گل' گوردیو سنگھ سدھو' امرجیت چندن' چرنجیو سنگھارا سنگھ بھلر' ساردول سنگھ' کالج کے طالب علموں نے مجھ' لائبریری میں چڑاس کرنے والے' سے پیار کیا اور میری ادھ کچری تحریروں کو سنوار کر آگے چلنے کا ڈھب سکھایا۔ ملازمت کے دوران لکھی تریریں گو کہیں چھپ نہیں سکیں اور آج تک میرے پاس سمبھال کر رکھی ہوئی ہیں لیکن تب کی لکھی ایسی "دانا" تحریروں کی وجہ سے مجھے اپنے آپ پر فخر محسوس ہونے لگتا ہے۔

ویسے مختصر کہوں تو لکھنے کے وقت مسقف کمروں کی میں نے تمنا نہیں کی۔ بس' "ہوا محل" میں بنے کمروں میں ہی بیٹھ سکا ہوں۔ یوں تو لکھنے کے کمروں کی داستان ہی الگ الگ ہے۔ پٹرول پمپ والے کمرے کی بھی یاد آ رہی ہے جہاں ساری رات جاگ کر موٹر کاروں میں تیل ڈالنا پڑتا تھا یا پھر پڑھنے لکھنے کا کام ہوتا تھا۔ جہاں کئی بار کہانی لکھنے کے دوران میں آنے والے گاہکوں کو خالی لوٹا دیا کرتا تھا اور اس طرح کم بکری ہونے کے باعث مالک جھنجھلا اٹھتا تھا۔ وہ میانہ قد کا آدمی جب سویرے تڑکے آتا تو کم روکڑ دیکھ کر اسی پل میری کتابوں اور لکھے ہوئے

کاغذوں کو کھڑکی کے باہر پھینک دیتا تھا۔ اور پھر کھانسنے اور بلغم تھوکنے لگتا تھا۔ اس پٹرول پمپ پر کام کرتے ہوئے میں نے ایک بھول' آپ بیتی' جگ بیتیاں ماں ہے پتا پتا نہیں' ماں بیٹی' ایسی کہانیاں لکھیں اور ان دنوں کے موبل آئیل' ڈیزل اور پٹرول کی باس ابھی تک میرے ہاتھوں کا سرمایہ ہے جس نے مجھے تخلیق کے راہ پر گامزن کیا۔

جرات و سدا کچھ بڑھایا کر گزرنے کی کرتا رہا ہوں مگر پہلے کے مقابلہ میں آئندہ کوئی بڑھاوا دوزخ نہیں ملا۔ لکھنے کا بھوت لگاتار سر پر سوار رہا ہے' اور لکھنے کے لئے وقت وقت پر جو بھی جگہ میسر آئی ہے' زمانے کے مطابق ایسی کچھ بری نہیں رہی۔ وہ کمرہ جہاں کام کرتے ہوئے میں نے مصروف آدمی' چھوٹی بہو' چھوٹا سا لڑکا' وغیرہ افسانے لکھے' مار کفیڈ کنیریز کا بہت بڑا ہال تھا۔ اس وسیع و عریض ہال میں میز و کرسیوں کی جگہ پیاز' مٹر' آلو اور ساگ سٹیم کے ذریعے سکھانے والا پلانٹ لگا ہوا تھا جس کی پاچن لوہے کی بیلٹوں پر الگ الگ پوائنٹ پر سیم دینے کی میری ڈیوٹی تھی۔ اور یہ کام کرتے وقت دیوار کے بیچ لگے ہوئے ہینڈل پر کنٹرول کرنے کے لئے ہر دم چوکنا رہنا پڑتا تھا۔ وہاں رات کے دو بجے ڈیوٹی پر آنا پڑتا تھا۔ غیر حاضر ہونے یا پچھڑ جانے کی صورت میں یومیہ اجرت کاٹ لی جاتی تھی اور اسی خوف سے شام کو ہی آکر فیکٹری کے برآمدے میں بیٹھ جاتا تھا اور وہاں روشنی کا فائدہ اٹھا کر پڑھ لکھ لیتا تھا---- وہیں اس لکھنے کے منحوس مرض کی وجہ سے خیالوں میں غرق ہونے سے مجھے ہینڈلوں کی یاد ہی نہیں رہی تھی اور بلب پھٹنے کی وجہ سے ہوئے زور دار دھماکے نے ساری فیکٹری کو ہلا دیا تھا۔ سارے کامگاروں کے خیال میں میں گاڑی بھاپ میں جھلس کر مر چکا تھا۔ مگر میں نے حوصلے سے کام لیتے ہوئے نالی میں سے بھیگی ہوئی بوریاں اٹھا کر انہیں ٹوٹے ہوئے بلب کے اوپر پھینک دیا تھا اور حادثہ سے بچ گیا تھا---- اور میرے کمرے کی ہوا ویسی کی ویسی سلامت میرے گرد پھیلی رہی تھی۔ میرے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی قلم میں لرزش نہ آئی تھی' اور میں ایک قدم آگے بڑھ گیا تھا۔

کئی جگہ میرا لکھنے کا کمرہ قدرت کا گہوارہ بھی بنا جہاں کچھ بھی بناوٹی نہیں ہوتا۔ یہ ۶۷-۶۸ء کے دن میرے دل کے صحن میں سلیس گاڑ گئے ہیں جن پر منقش آئتیں میری دشوار زندگی میں مشعلوں کا کام دیتی ہیں۔ تب میرے لکھنے کے کمرے کی دیواریں تیز' سنہری دھوپ کی ہوتی تھیں جس کے اندر بچھا ہوا خشک' زرد گھاس کا پلنگ بہت سخت ہوتا تھا۔ اس میں بڑی تپش ہوتی تھی۔ قدرت کے اس جھولے کو جھولتے ہوئے میں نے ڈیڑھ درجن کہانیاں لکھیں ہوں گی جو جوں کی توں میرے پاس سمبھال کر رکھی ہیں' قیمتی دستاویزوں کی طرح۔ وہ ایسے دن تھے جب لوہے اور سیمنٹ کے بڑے بڑے پال ناتواں کندھوں پر ڈھونا پڑتے تھے' جانوروں کی طرح چھاتی کے گرد رسے باندھ کر میلوں تک تار کھینچ کر لے جانے پڑتے تھے۔ راستے میں آنے والے ندی نالوں کو تیر کر پار جانا پڑتا تھا اور گڑھے کھود کھود کر پول کھڑے کرنے پڑتے تھے اور اس قدر مشقت کرتے ہوئے جب بھرئی دوپہری میں گھنٹہ دو گھنٹہ آرام کرنے کا وقت ملتا تھا تو کاغذوں کا جھولا اٹھا کر اوروں سے الگ دور جا کر بیٹھتا تھا' اپنے کمرے کی غائبانہ دیواروں کے درمیان---- اور یا پھر رات گئے کھانا پکا کھا کر جب فارغ ہوتا تھا تو کرائے پر لی ہوئی کوٹھڑی کے ایک کونے میں چراغ جلاتا تھا۔ یہ دن مالہل پور کے پاس پالکی گاؤں میں بیتے یا نواں شہر کے قریب گاؤں ہنسروں میں۔ اور یہ کام کرتے ہوئے کبھی کبھی اپنے افسر لائین سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں بیٹھ کر پڑھنے کا بھی موقعہ مل جاتا تھا---- بہت ساری کتابوں س بھری ہوئی میز اور گریدار کرسی۔ مگر یہاں بیٹھنے کے لئے جو بیگار بھرنی پڑتی تیھ' اس کا ذکر بھی کرتے ہی بنتا ہے۔ ہمارے ہی بیچ کا ایک لڑکا لائن سپرنٹنڈنٹ کا دو وقت کا کھانا بناتا تھا' برتن مانجھتا تھا' کپڑے دھوتا تھا اور پھر باہر ہمارے ساتھ کام بھی کرتا تھا۔ جس دن وہ لڑکا نہیں آتا تھا تو اس گاؤں میں رہنے کی وجہ سے وہ سارے کام مجھے کرنے پڑتے تھے۔ کھانا کھلا کر' برتن مانجھ کر' صاحب' کا بستر لگاتا اور سونے سے پیشتر اس کی گنجی چاند پر بادام روغن کی مالش کرتا۔ وہ شراب کے نشے میں دھت کئی بار مجھ سے کہتا---- "اوئے سالے پریم! میری

کہانی لکھ..... لکھ میری کہانی..... سنا' میں نے کیا کہا؟"—— وہ گالیاں دیتے ہوئے زور زور سے بولتا تو اڑوس پڑوس میں دیواروں کے اوپر سر اگ آتے۔ کئی بار اس کے گھر جا کر چڑی کاٹنی پڑتی۔ جس گھر سے اس کے لئے دودھ آتا تھا' دودھ والی عورت کا گھر والا امریکہ گیا ہوا تھا۔ کبھی کبھی وہ خود دودھ لے کر آ جاتی تو "صاحب" خوش ہو جایا کرتا تھا' اس خوشی میں اس کے کام بھی کبھی کبھی کرنے پڑتے تھے۔ اور یوں بیگار کے پانیوں کو عبور کر کے جب مجھے لکھنے کے لئے کچھ پل نصیب ہو جاتے تو کندھوں کا بوجھ ایکا ایک پھول بن جاتا تھا۔

اور ان لکھنے کے کمروں میں صرف ایک اور جگہ ایسی ہے جہاں اٹھتے بیٹھتے میں قابل ذکر اور طویل عرصہ تک لکھ سکا ہوں—— یوں تو "اجیت" اخبار کا دفتر میری روزی کا وسیلہ رہا ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ مجھے وہاں لکھنے کی سہولتیں حاصل رہی ہیں۔ ڈھیر سارا کام' پروفوں کے بغیر کاپی جوڑنا اور پاس رکھے ہوئے ٹیلی پرنٹروں کی مغز چاٹنے والی ٹک ٹک..... بہت رات گئے خالی ہونا اور پھر ایک کونے میں لگی ہوئی میز پر قبضہ جما کر لکھنے کا جنون..... خبط—— جاڑوں میں ہیٹر جلاتا تھا اور گرمیوں میں پنکھا—— یہاں کام کرتے ہوئے میری کہانیوں کی کتاب چھپی' دو ناولٹ لکھے اور کئی افسانے رقم کئے۔

اور آج ایک کمرے کا تصور ستارہ قطب کی طرح اور اس آنکھوں سے دور سپنے کی مانند ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ آج جبکہ جالندھر کی کچی کوٹھری کی جھڑتی مٹی کی چھت کے نیچے سے' حقے کی سڑاند سے بھرے گھر کی چار دیواری سے نکل کر اونچی پتھر جڑی کوٹھیوں میں آ بیٹھا ہوں تو لکھنے کا کمرہ یہاں بھی ہاتھوں کی پکڑ میں نہیں آ سکا۔ یوں تو بجلی کی روشنی آٹھوں پہر پاؤں تلے بچھی رہتی ہے۔ مگر اس میں کوئی تازگی محسوس نہیں ہوتی..... سب کچھ باسی باسی' پژمردہ سا ہے۔ اور یہاں ملے ہوئے کمرے میں مجھ سے بیٹھا نہیں جاتا..... پاؤں کھیتوں کی راہ پر چلتے ہیں' کسی من پسند' خوبصورت جگہ کی جستجو میں ایسی جگہیں جن کی یاد میرے کندھوں جتنی اونچی کھڑی ہے—— خاموش' پرسکون ویشنو دیوی کے پہاڑ کے چرنوں میں

بہتی گنگا کے پرلے کنارے کی سفید ریت جہاں بیٹھ کر "ایک ٹکٹ رام پور پھول" کہانی لکھی۔ اور بھیانک راتوں میں کانووں کے پتن کے پل کے پاس شیو مچھیرے کی جھونپڑی کے سرد دیئے کی لو میں بیٹھنا جہاں رہتے ہوئے میں نے ایشور کا بھائی "یار بلوچ' بدلہ' گلابی لڑکی ایسی کہانیاں لکھیں۔ پریت نگر میں مختیار کا گھر جہاں خیراں ہار گئی' فوجی لانگری اور دشمن لڑکی' دوسرے چوک تک' جیسی کہانیاں تخلیق کیں' اور جس کمرے میں میرا "خود" کچھ بھی نہ ہوتے ہوئے بہت کچھ ارتقاء کر گیا تھا اور جس میں سے بہت کچھ اگ آیا تھا۔ اور پھر مایوہ کے شائیں شائیں کرتے مویشیوں کے باڑوں کی دل کو چھونے والی کتھائیں جہاں بہتی ہوئی ہوائیں چار دیواری بن کر کھڑی ہو جاتی تھیں' جہاں لفظوں کے بے شمار جھونکے منڈلانے لگتے اور جہاں کچلے چولہوں پر بار بار تیز' کڑوی چائے بنتی رہتی' زردے کی پڑیاں کھلتیں' نسوار کی چٹکیاں ناکوں کو سیاہ بناتی رہتیں..... توبہ! میں کہاں پہنچ گیا ہوں..... ویسے یہ میرے لکھنے کے کمرے کا ہی دائرہ ہے!

اب کی گھڑی---- اب جبکہ میں یہ سطور لکھ رہا ہوں' میں ملک کے جدید شہر کے صوبے کے دارالحکومت میں بیٹھا ہوا بھی جیسے اپنے نانا کے گاؤں کی ویران جگہوں پر بیٹھا ہوں..... جہاں راتوں کو گیدڑ بولتے ہیں اور دن میں خرگوش کا شکار کیا جاتا ہے۔ دیکھو! میرا لکھنے کا کمرہ کہاں بنا کر کھڑا ہوا ہے..... میرے ماتھے کے سامنے..... کسولی کے پہاڑ کے پرے زریں و سرخ و گلابی طلوع ہوتے آفتاب کی کرنیں عرش کو چرتی ہوئی اٹھ رہی ہیں اور میں اجڑے ہوئے کوئیں کی من پر بیٹھا ہوا "میرا کمرہ" لکھ رہا ہوں۔ میرے پیچھے کی طرف ایک گھوڑا گھاس چر رہا ہے جس کی داہنی ٹانگ کسی مرض کا شکار ہو کر آگے کو بڑھ کے پیر سے بری طرح ٹیڑھی ہو گئی ہے گھوڑا جب ہری گھاس کے بڑک بھرتا ہے تو تڑ تڑ کر کے رسّیوں کی ٹوٹتی ہوئی آواز زندہ رہنے کا احساس کراتی لگتی ہے۔ داہنے ہاتھ ہوائی اڈے کے اوپر اڑان بھرنے والے ہوا بیماز کی فضا کو گونجا دینے والی آواز اتنا سویرے بہت غیر سی لگتی ہے۔ اور ایک کمسن لڑکا کندھے پر ٹوکری اٹھائے آدم کے پیڑوں کے نیچے سے

آم اٹھاتے ہوئے خوش خوش اڑتا پھرتا ہے' تتلی کی طرح- میری بائیں جانب پھیلا ہوا ٹریل گاؤں اتنا دن چڑھ آنے پر بھی سویا سویا لگ رہا ہے- اور میرے پاؤں کی سیدھ سے پرے بری کی طرف کبھی کبھی میری نظر کود کر چلی جاتی ہے جہاں ایک بہت بڑے بل کے پاس کانٹوں میں پھنسی ہوئی' ہوا سے تھرتھرا رہی سانپ کی اتری ہوئی کینچلی بری کو اور بھی دہشت زدہ کر رہی ہے---- اور اس طرح آج کے میرے لکھنے پڑھنے کے کمرے میں پھیلا ہوا میرا "خود" آپ دیکھ سکتے ہیں..... کمرہ جو میرے خود کو اپنے کونے ایسا ہے.....

اور آج جب سورج انگلی بھر اوپر سرک آیا ہے اور بیتے ہوئے سالوں کی کشمکش کے بعد میں نے آپ کو یہاں لا کر کھڑا کیا ہے' یہاں آپ کی نظر ذرا گہرائی میں جانی چاہئے..... اور آپ دیکھ سکتے ہیں---- ذرہ ذرہ کر کے جڑا ہوا اک ٹیڑھا میڑھا کمرہ آپ کے سامنے کھڑا ہے جس کا نام میں نے کی جگہ آپ نے "پریم گورکھی" رکھا ہے اور میرے مہربانو! اس کمرے کی کوئی بھی چھت نہیں ہے' تاہم آندھی اور بارش کے دنوں میں آپ کو چھپانے کے لائق جگہ ضرور ہے..... اس کی چاروں سمتوں کی طرف کھلنے والے دروازے کبھی بند نہیں ہوئے- یہاں کوئی بھی ایسی پری نہیں ہے جو آپ کے آنے پر پہلے تو ہنس پڑے اور بعد میں رو دے- یہاں تو چاروں دروازوں میں گورکھی کے محنتی ہاتھوں کی کساوٹ ہے- اس کی دیواریں کبھی جھڑیں گی نہیں' نہ ہی اسے کلر کا ڈر ہے نہ دیمک کا..... کیونکہ اس کی تعمیر میں کوئی ادھار کی چیز نہیں ہے..... آپ کی ہنکاری کا سینک ہے..... آپ کے ہاتھ سے لگائے گئے پھولوں کی مہک ہے.....!

مختار گل 1947

میں نے گھر نہیں بنایا۔ مجھ سے کسی نے کہا تھا "مختار کو شناخت نہیں ہے' وہ گھر کبھی نہیں بنا سکتا..... اس کی فطرت ہی نہیں ہے گھر کا پنچھی بن جانے کی' پنجرے کا پنچھی ہیں نہیں بن سکا۔ میں بھٹکتا رہا' تاہم کسی کو کیا؟"

پھر بھی ماضی کی سسکیوں اور قہقہوں میں اتنی گہرائی تو ہے' اتنی تڑپ تو ہے کہ میں یہ ماننے کے لئے مجبور ہوں کہ ماضی ہی میرا سرمایہ ہے' سب کچھ ہے---- بیشک میں حال مست ہوں پر صرف کھانے' لذت اندوز ہونے کے لئے کسی کھنڈر جیسی شدت کے ساتھ محسوس کرنا مجھے نہیں آتا۔

بیکار ہی ماضی میں گہرا اترتا جا رہا ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ جس یا جن کے ہاتھ میں چپو ہیں' وہی ناؤ کو غرقاب کر دینا چاہتے ہیں۔ مگر میں اسی ضد پر اڑا ہوں---- ماضی کا دریا تیر کر اس پہاڑ کی چھایا کے نیچے والے کنارے ضرور جا لگوں گا' کبھی نہ کبھی' جہاں نیلو ہے' میری نیلو!---- اس استفہامی نگاہ کے جواب کے لئے میں ضرور حاضر ہوں گا---- لیکن پھر کبھی!

نیلو کہتی تھی' "میں گھر بنا لوں گی' حامی تو بھرو---- اگر حامی نہیں بھر سکتے تو مجھے کھینچ کر ایس' ڈی' او..... سنگھ سے چھین لانا.....!" گل چوہان زور سے ہنس پڑا تھا---- میں نہ مرزا تھا' نہ رانجھا!

اور آج بہت برس بیت گئے ہیں۔ میں اس قدر ہمت مجتمع نہیں کر سکا کہ اسے کسی افسر کے پاس سے چھین لوں۔ میں نہیں جانتا' وہ کہاں ہے؟ مجھے نہیں پتہ کہ وہ کس چوٹی کے پتھر سے لگ کر "نیلم" ہو گئی؟ مجھے تو صرف آنکھوں کے نیلم

کی پہچان تھی، پتھروں کی نہیں۔ پھر پتھروں کو کیا پڑی ہے کہ وہ میرے بن جائیں!

ہاں، اتنا ضرور یاد ہے، اس نے لکھا تھا---- "ہم جیسوں کی دیوالیاں اکثر اوداس ہوا کرتی ہیں۔ آج کی شام بہت اوداس ہے، بجد بوجھل...... تم ملول مت ہونا۔ اوداسی اور ملال کی بات دیواروں سے کہہ لینا۔ رہی خط کی بات---- کیا تمہاری نظمیں اور افسانے میرے نام لکھے طویل خط نہ ہوں گے......"

میں دیواروں کی طرف بہت عرصہ دیکھتا رہا۔ میری صبحیں بھی اور میری شامیں بھی بیت جاتیں۔ مگر یہ حادثہ ہو جانے کے بہت عرصہ بعد بھی میں جذباتی ہو جاتا رہا، مثلاً ۸ فروری ۱۹۷۶ء کی اوداس شام میری ڈائری کے تھوڑے سے خالی صفحوں پر ساری کی ساری اتر آئی تھی---- "پچھلے دنوں سے پریت نگر چھوڑ کر چلے جانے کو جی کر رہا تھا۔ مگر سوچتا تھا، اگر کبھی بعد میں نیلو کا خط آ گیا تو کیسے ملے گا؟" اس وجہ سے آج تک چپ ہوں، اوداس اور تنہا ہوں۔ تاہم یہ میرا نجی معاملہ ہے، کمرے کا نہیں۔ کمرے سے گھر تک کا سفر ضرور کیا ہے مگر پہنچا کہاں؟

کمرہ کمرہ ہوتا ہے خواہ پریت نگر کا ہو، سرجیت پاتر کا ہو یا ہرنیک کا یا بیبا بلونت کا۔ عجیب سکون ضرور ہوتا ہے۔ یہی "سکون" سفر بن جاتا ہے، کمروں تک کا سفر......

میڈیکل کالج کے ہوسٹل کا ۱۵ اے...... اس کمرے سے کیشو کا نام اس طرح وابستہ تھا جیسے روندر کے ساتھ بلا، نیلو کے ساتھ ٹھاکر یا کسی اور کے ساتھ جیسوال!---- یونیورسٹیوں کے کمرے تین سو دو، ایک تین اٹھارہ یا ای ۳۱ سب بانہوں میں لینے کیلئے تیار رہتے۔ ہاں، یہ لازمی ہوتا کہ شراب دور سے لانی پڑتی تھی اور رات گئے ٹھیکیدار سے باسی، تباسی، کچی پکی روٹیاں کھانی پڑتی تھیں۔

پاتر کے کمرے سے اس کے مقابلہ میں، میں زیادہ جڑا ہوا تھا۔ یہاں اکثر میں مہرجیت، کرم جیت، روندر گھٹل، پالی، پرمندر جیت، پو جیئر وغیرہ دوست (لازمی نہیں کہ سارے حاضر ہوں) بوٗ کا اس طرح انتظار کرتے جیسے "رب ورگا آسرا تیرا، چیھتی کتوں بہڑ مترا"---- پاس سے مہرجیت بول اٹھتا---- "ہتھ بوتل

ہووے سولن نمبرون' باقی لے آواں گے....." یہاں ہم ساری یونیورسٹی کی مٹر گشت کے بعد تھکے ماندھے ہوتے۔ شراب مل ہی جاتی تھی' اس امید کو لے کر نہاتے' کپڑے دھوتے اور پھٹی پورانی کوئی پاتر کی تہہ باندھ کر مہمان صاحب میزبان شاعر کی نظم کی داد دیتے۔

میرے کمرے کا بھی یہی دستور رہا۔ یہاں مہمان کبھی میزبان بن کر آتا اور میزبان کو مہمان بنا کر ساتھ لے جاتا۔

ہرنیک کے چوبارے' جودھ' میں اور دلبیر کھڑکی کے راستے اس مہاراجاؤں کے ظہور کی تاثیر پہچان پہچان کر عاشقیاں کرتے۔ یک چشم شراب فروش کو یاد کرتے جس کا ابھی بھی "کمرے" کے سر پر قریب چار سو روپیہ قرض ہو گا۔ مگر کمرہ تو مالکوں کا تھا' ہمیں کیا؟---- لو کے کمرے میں پاتر کی طرح بھیڑ ہوتی۔ امتوج کا حسین ساتھ یا کیمپ میں "پر بھوجی کوئی ایسی جگت کرو' داس کو تو کمت کرو....." وکل کی دعا میں شامل۔ بھوشن کے مذاق کرتے ہوئے بھی بات مہرجیت پر ختم ہوتی---- جس رات اس نے خورشید کو شام کو خریدی ہوئی بنیائینوں میں سے ایک دے دی تھی اور رات کو خورشید شراب کے نشے میں دھت سو کے نوٹ کے بجائے سو کا نوٹ ٹھیکے والے کو دے آیا تھا تو وہ "دوستو! مار ڈالا رے!" کہتا ہوا کمرے سے نکل کر ٹھیکے کی طرف لپکا تھا---- وہ آج تک نہیں لوٹا۔

پھر رفتہ رفتہ کمرے بیاہے جاتے رہے اور "گھن" بنتے رہے۔ ہماری جستجو جاری رہی۔ ہم کو پھرپالی کے ان بیاہے کمرے جھیلتے۔ میں آج تھکا ہارا سب طرف سے ٹھکرایا ہوا لوٹا ہوں۔ کمرے میں آکر بیڈ پر لیٹ گیا ہوں۔ بالکل چپ چاپ۔ کسی کو نہیں بلاؤں گا۔ دیواریں گونگی ہیں۔ فریم کی ہوئی تصویریں دھندلی ہیں۔ سب رشتے مٹھی کی ریت کی طرح پھسل گئے ہیں۔ میں سامنے دیکھتا ہوں۔ کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے---- "میں تمہارا کمرہ ہوں' مختار!" میں جانتا تھا' تم آخر ایک دن واپس آؤ گے۔ اس لئے کتنے ہی برس تاریکی میں بیٹھا میں تمہارا انتظار کرتا رہا۔ تم تو سسکنے لگے---- سسکی کی گہرائی میری سمجھ میں آگئی ہے۔ جس طرح تم گئے

تھے' دیکھ لو میں اسی طرح تمہیں بانہوں میں لینے کو تیار ہوں۔ مگر تم ابھی بھی ماضی کی طرف دیکھے جا رہے ہو۔ چھوڑ یار! بوتل میں منی پلانٹ لگا دینے سے دل میں منی پلانٹ نہیں اگ آتا۔ جب نیلو یہاں بیٹھی ہوئی کافی بنا رہی تھی' تم نے اس سے کہا تھا۔ "نیلو! مجھے اس گملے میں لگا دو۔ جب سچ مچ تم جاؤ تو مجھے گملے سمیت لے جانا۔ میں بہار اور خزاں کو دیکھ کر جی لوں گا..... پلیز نیلو!....." اس وقت تمہاری سہیلی نیلو "گھر" بنا لینے کا سپنا بنا کرتی تھی۔"

"اس طرح میری ہستی کیا مٹ جانا تھی؟"

"میں تمہاری دوستی سے منکر نہیں۔ مجھے تم نے سدا "گناہ" کرنے کا سہارا دیا۔

میں نے پہلا اور آخری گناہ یہی کیا تھا۔ حنا کی مہک اور سہاگ کی چوڑیوں کی کھنک کا احساس تمہاری گود میں مجھے ہوا تھا۔ مگر دوست! تمہارا ساتھ میرا حاصل ہے۔ پھر میری ہار کو تم اپنی ہار کیوں نہیں سمجھتے؟ میری محرومی کو میری تقدیر کیوں تسلیم نہیں کرتے؟

"اچھا' تمہاری ہار سمجھ لوں اور تمہاری دوستی سے بھی انکار نہ کروں' اور تم جب جی میں آئے' مجھے "گھر" کے سامنے ذلیل کرتے رہو۔ کوئی آئے تو ہولے سے باہوں میں لے کر کہہ دو۔ "تم اسے گھر بنالو لو!" مگر آج غصہ مت کرنا۔ آج تم سب طرف سے ٹھکرائے' شکست خوردہ اور تھکے ٹوٹے ہو' تاہم تم "دوستی" ضرور سمجھ گئے ہو۔ اور مجھے اکیلے کو ہی نہیں چھوڑ کر گئے آٹھ سال سے اپنی کلائی پر بندھے ہوئے تاروں کی چمک بھی بھول گئے۔ میں نے اس چھوٹی سی گڈی کو ضرور "گھر" کہہ سکنے کی چھوٹ دی تھی جس نے ایک رات میری دیوار پر لکھا تھا---- ۳۱ مئی ۱۹۷۵ء اپنے پیارے اور بڑے اچھے بھائی کے پاس ۲۸ مئی سے ۳ جون تک کیمپ لگا تھا۔ اپنے گھر کی دہلیز کو بوسہ دیا۔ سارے گھر کو لے کر بندر بھائی کا بہت انتظار کیا۔ اپنے پیار میں اکیلی رہی۔ اپنا بھائی بہن کے گھر کا احساس جو تھا۔ شفاف جھیلوں میں تیرتے ہوئے پھول جیسے بھائی کے لئے ایک بھابی لے آؤ..... چھوٹی

سندو "اس کے آگے میں نے مٹا دیا تھا کیونکہ کسی اور کے گھر بنانے کی بات جو آ گئی تھی۔ اور لوگوں کو تو میں کبھی کبھی گھسنے ہی نہ دوں..... ٹھیک ہے' پیارے! چلو ایک جام اپنے اپنے ماضی کے نام پر ہو جائے!"

"نہیں' بیتے ہوئے وقت کے لئے کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ جام ٹکراؤں گا آج کے نام پر! ہاں' تمہاری اس کا کیا حال ہے؟ میں نے سنا تھا کہ اس کا ڈرامہ یا پوئٹری کا پیپر تمہارے دوست کے پاس ہے' اسی یونیورسٹی میں' چلا جائے گا چکر؟ تنہائی' اوداسی اور ترس کا رونا....."

"چلو' بیکار میں مت بولے جاؤ..... وہ کسی دن آئے' ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیں گے۔ مگر تم پھر گھر سے چڑ جاؤ گے۔ طعنوں پر اتر کر کبھی یاریاں نبھائی جاتی ہیں؟"

"نہیں' نہیں یار! گل چوہان کا کیا حال ہے؟ اسے بھی لے آؤ۔ ہم تینوں کبھی اتنے برس ایک ساتھ رہوے تھے۔ تم خود سدا ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی مساعی میں لگے رہتے تھے۔ یہ مجھے بہت بڑھیا لگتا تھا۔ ایک اگر کچھ عمدہ لکھتا تو دوسرا سارا زور لگا کر اسے کاٹنے کی سعی کرتا۔ اس مقابلے میں بڑا لطف آتا تھا۔ اسے لے آؤ۔ اب تو وہ بھی....."

"اب تم کس لئے ماضی کی دلدل میں اتر رہے ہو؟ اگر میں بوڑھا ہو گیا نا' تو میری لڑائی اجیت سے ہی رہے گی۔ تم بھی تب تک....."

"کیا میں دنوں دن کھنڈر بنتا جا رہا ہوں۔ میرے پلستر گر رہے ہیں۔ کھنڈر پر تعمیر کرنے کا کسی کو چسکا لگاؤ۔ رحم پیدا کرنے کے لئے آخر مجھے یہ تو استعمال کرو گے۔ مگر میرا خیال مت کرنا....."

"یار' پھر طعنوں پر آ گئے ہو! تمہارے بوتے پر ہی تو میں جو کچھ ہوں یا بن سکنے کا خواب سجائے بیٹھا ہوں۔ اگر تم ہی یوں کرنے لگے..... بتاؤ تو' میں نے پہلی کہانی "آخری چوڑیاں" کی کنتی کا سارا درد تمہارے ساتھ نہیں بانٹا تھا کیا؟ تمہاری گود میں ہی میں نے بوا کا تھوڑا سا قرض چکانے کی کوشش نہ کی تھی؟ اس

رات جب ہم دونو جاگے تھے' بیچین' تلخ اور اس رات..... "مٹی کی چڑیا" بنتی رہی تھی- تم نے ہی تو بوڑھے پنشنر کے درد کا مجھے احساس کروایا تھا- تم ہی تو اس کے لئے بڑی محفل سے بھی ایک دو پیگ بچالیت تھے تاکہ میں اس کو پلا کر ملایا و آسام کے جنگلوں میں ایک بار پھر آزادی کے لئے بھوک پیاس جھیل کر لڑنے مرنے کو "کالے پہر" کا نام دے سکوں- اور بتاؤ' میں تمہارے بنا کبھی حرف بھی لکھ سکتا تھا؟ ہاں' دوست! تم نے میرا کتنا کچھ سمبھالا ہے- ہاتھ جوڑے ہوئے لڑکی کی بہت پیاری تصویر..... وہ پلک پر ٹکے ہوئے آنسو والی لڑکی اسی طرح فریم میں سے دیکھ رہی ہے- میری---- دوست لڑکیوں اور احباب کی دھندلی پڑتی جا رہی تصویر میں اسی طرح محفوظ ہیں- یہ تم ہی کر سکتے تھے دوست! باقی' یار! تم نے ہی تو مجھے اور میرے دوستوں کو لکھے ان کی محبوباؤں کے خطوط سمبھال کر رکھے ہوئے ہیں- وہ ٹھیک ہی سوچتے تھے' کہاں خطوط محفوظ رہیں گے! ہاں' اور میرے تحریر کئے خط بھی تو نیلو تمہیں دے گئی تھی- کہتی تھی---- "ساتھ بھی لے جا نہیں سکتی---- اور پھاڑ بھی نہیں سکتی....." شائد کبھی ملیں گے تو انہیں پڑھیں گے- شائد..... اس کے آگے نہیں- کتنے پیار یہاں دفن ہوئے ہوں گے بھلا؟"

"اچھا' یہ الزام بھی تمہیں اپنے کمرے کے سر مڑھنا تھا؟ تمہارے پیاروں کو تو میں نے پھولوں کی مانند رکھا- اس تصویر کی طرف دیکھو- تمہارے شاعر دوست کی محبوبہ نہیں تھی؟ اور وہ لپ سٹک والے ہونٹوں کے نشانوں کی گواہی کینیڈا والی دوست کی نہیں؟ میں اور کیا کہوں؟ آخر تمہارا کمرہ ہوں' یار!"

ایک بار پھر آؤ..... سارے میرے یارو! ایک بار پھر آؤ- محفلوں کے لئے ترس گیا ہوں- ہنگاموں کا دور چلاؤ- "تمہارے نام'..... تمہارے نام....." والا رقص کرنے والا پاتر..... امتوج کا کھیا' کہنا' موہن جیت کا اگواؤں کو مزار بننے کا سراپ دے جانا..... اور ملک کے کئی رنگ میری دیواروں کو مس کرتے رہے..... کنول کا صرف بیئر پینا' پالی اور مہرجیت کا دارو کی تلاش میں جانا' ہرنیک کا شعر سناتے رہنا' گورکھی کا لکھنا..... پر مندر جیت کا "قبر" سمجھنا..... سب ایک بار پھر ہو!

"دیکھ لو، پھر ماضی کو جینے کی تمنا نہیں کر رہے ہو، کیا؟"

"جینے کے لئے، میرے دوست! اس سے زیادہ کرنا پڑتا ہے....."

"جاؤ، آج والا خط پڑھو اور اسے پکڑو۔ اسے ساتھ لے آنا۔ لکھتی تو ہے کہ باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے..... لو، تم تو سو گئے۔ میرے بارے جو لکھنا تھا! نیند تو آئے گی ہی۔ ٹھیک ہے، مجھے تو دینا ہی دینا ہے..... کمرہ جو ہوں! چنیدہ کتابیں نیلو کی دی ہوئیں---- "لسٹ نار لائف" مون اینڈ دی سکس پینس، دھرتی، ساگر اور سیپیاں، نہ آنے والا کل، سکھ سے لی ہوئی بوڑھا اور سمندر، ڈاکٹر ڈیو، اور اپنی جیک لنڈن، پلیگ، دھپے نہ چھاویں، رسیدی ٹکٹ، دوسرے کنارے کی تلاش، چلتے پھرتے مسخرے، سدھارتھ، میری کہانی، میں نے سب سمبھال کر رکھیں۔ میں جانتی ہوں، تم ان سے اوداسی لیتے بھی ہو اور دیتے بھی ہو.....! تم تو خوابوں کی دنیا میں کھو گئے ہو۔ پھر کہیں بگلوں کی جون میں نہ پڑ جانا---- اچھا، آمین!"

ہرجیت 1950

گھر نیا بنا تھا اور پرانے کرائے کے مکان سے سامان اٹھا کر وہاں لے جانا تھا۔ ماں ساری عمر اپنا گھر' اپنا گھر کہتے نیا گھر دیکھنے سے پہلے جا چکی تھی۔ 1947ء کی اکھاڑ پچھاڑ کے وقت ایک چھوٹا سا گھر ملا تھا اور پھر نئے سرے سے زندگی شروع ہوئی تھی۔ سامان تو سب جا چکا تھا' میری ٹرائیسکل' ٹوٹے پھوٹے ڈبے اور کچھ پرانے کھلونے باقی تھے۔ ٹرائیسکل تین بچپن بتا چکی تھی۔ پہلے بڑے بھائی کے پاس' پھر منجھلے بھائی کے قبضہ میں اور اب میری جائیداد بن گئی تھی' جگہ جگہ سے ویلڈنگ کی ہوئی' بے رنگ ٹرائی سکل!

والد اسے کوڑا سمجھ رہے تھے۔ کوئی بھی اسے نئے گھر لیجانے نہیں دے رہا تھا۔ بازیگروں کے بچے میری ٹرائی سکل اور کھلونوں کی ناک میں آس پاس منڈلا رہے تھے۔ کھلونے میں نے ایک ایک کرکے ٹرائی سکل پر رکھے اور دوپہر کو جب سب اونگھ رہے تھے' میں ہولے سے چل پڑا۔

نیا گھر سامنے دکھائی دے رہا تھا مگر اُونچے نیچے راستے پر چھوٹے چھوٹے پاؤں مشکل سے پیڈلوں تک پہنچتے تھے کبھی پالش کی ڈبیا سے بنائی ترازو گر پڑتی تو کبھی مٹی سے بنے رو ئیے۔ دیا سلائی کی ڈبیا کے بنائے ریڈیو کو دھول مٹی پر سے اٹھانے ہی لگا تھا کہ کسی نے بالوں سے کھینچ کر اٹھایا۔ مٹی کے روپے' خالی ڈبے اور ٹوٹے کھلونے اس نے سامنے دیوار پر پھینک مارے.....

نئی ماں ایک ہاتھ سے مجھے اور دوسرے ہاتھ سے ٹرائیسکل کو گھسیٹتے ہوئے نئے گھر کی دہلیز تک لے گئے۔ دہلیز پار کرتے ہی یاد آیا---- پرانے مکان کے

کونے میں بنایا ہوا گھر جس کے چاروں طرف میں نے سرکنڈوں کی باڑ بنائی تھی اور سرکنڈے جوڑ جوڑ کر دروازہ بنایا تھا۔ ڈھبریوں سے موٹر کار بنائی تھی اور مروئے کے پتے توڑ توڑ کر پیڑ بنائے تھے' ٹوٹے ہوئے ہولڈروں کے کھمبے بنائے تھے۔۔۔۔ مگر کوئی پاؤں دروازے سے ہو کر نہ گزرا۔ کچھ بے رحم پیر اچانک چھت کے اوپر سے گرے اور سب کچھ روند کر گزر گئے۔

"یہاں کچھ نہیں ہے بھائی! گیہوں کا گودام ہے!" کوئی مجھے پرے ہٹا کر تالہ کھولنے لگا۔

"ہم یہاں کبھی کرایہ دار ہوتے تھے!"

مگر دوسرا آدمی بنا سنے دروازہ کھول کر اندر جا چکا تھا۔

دل کیا ض۔۔۔۔ دوڑ کر جاؤں اور اس کونے میں اینٹیں اکٹھی کر کے پھر گھر گھر کھیلوں..... اور پھر اپنے آپ ہی ہنسی آگئی۔

اور ایک دن سب کو الوداع کہہ کر اپنے گھسے پرانے کپڑے ایک شکستہ ٹرنک میں رکھ کر چنڈی گڑھ جا پہنچا۔ ایک کوٹھی کے زینے کے نیچے ایک گندے سے کونے میں رہنے کیلئے جگہ ملی۔ تختیاں جوڑ جوڑ کر دروازہ بنایا اور اپنے کمرے میں پہلی رات..... گرمیوں کے دن تھے۔ امس اور گھٹن میں نیند کہاں آتی تھی؟ گہری رات میں کوئی دگڑدگڑ سیڑھیاں چڑھتا تو لگتا جیسے کوئی میری چھاتی پر پاؤں رکھ کر گزر رہا ہو۔ نیند نہ آتی تو کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا۔ سلین اور تاریکی کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے کاکروچ نکل کر ادھر ادھر گھومنے لگتے۔ تھکا ہارا باہر کی چار دیواری کے ساتھ لگے ہوئے کھمبے کے نیچے جا کر کھڑا ہو جاتا اور رات کو بیتتے ہوئے سنتا۔ کبھی گرمی نہ سونے دیتی۔ کبھی بھوک' کبھی کاکروچ اور اکثر اپنا آپ۔ گھر میں اپنا وجود فالتو سا لگتا تھا تو کمرے میں اکیلا پن۔ جی کرتا تھا' کوئی مجھے ڈھونڈتا ڈھونڈتا آجائے اور اس سلین بھری کوٹھڑی سے ہاتھ پکڑ کر باہر لے جائے اور کہے۔۔۔۔ "کہاں تھے' کھوجتے کھوجتے آنکھیں تھک گئیں!" مگر دراڑوں میں سے باہر جھانک جھانک کر میری بے خواب آنکھیں پتھرا گئیں۔

یونیورسٹی میں میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ میں کسی کو چائے پر ساتھ دینے کے لئے مدعو کر سکوں۔ ایک رات میں اور امتوج سڑک پر "جھلکی گراما" گاتے ہوئے اپنے آپ کو خوبصورت نگر میں شامل سمجھ رہے تھے جب ایک پولیس کے سپاہی کی گھڑکی سے ہمارے سانس رک گئے۔ پنچم سے پٹاخ اتنے نیچے گرے کہ پھر کبھی چنڈی گڑھ کی فراخ، روشن سڑکوں اور پیڑوں کو خوبصورت نہیں کہہ سکے۔ پندرہ سیکٹر میں پیڑوں کے نیچے لگے ہوئے دلیش راج کے ڈھابے پر ہمارا دونوں کا ایک حساب چلتا تھا۔ اور اب بھی وہاں سے گزرتے ہوئے پاؤں چونک جاتے ہیں جیسے ابھی بھی اس کا بقایا دینا ہو۔

کبھی کبھی گھر سے خط آتا۔ لگتا، یہ کون ہے جو مجھے بیٹا کہتا ہے۔ یہ کون ہے جو مجھے بھائی کہتا ہے۔ یہ کیسا ممتا کا رشتہ ہے---- کبھی میری اپنائیت کی بھوک ان کی روح تک کیوں نہیں پہنچتی؟ ہر شام جب کھانا کھانے کے لئے پانچ دس پیسے کھوجتے ہوئے کبھی آنسو نکل آتے تو لگتا، میرا ماں کا رشتہ کسی کے ساتھ نہیں ہے۔ لگتا ہے، کوئی بزرگ میرا باپ ہونے کا سوانگ کرتا ہے۔ وہ جب بھی یاد آتا، اس کا بھاری ہاتھ ہوا میں ملتے ہوئے کہہ رہا ہوتا---- "اپنی ماں کے سامنے بولنے کی جرات کرتا ہے؟" اور میں کسی کے بھی سامنے کچھ بھی بولنے کی جرات نہ کر سکا۔ جب بھی کبھی اپنے سے بڑے کسی آدمی کے روبرو پیش ہوتا ہوں تو لگتا ہے کہ الفاظ کھو گئے ہیں--- اور اس کے فربہ ہاتھ کو اپنے چہرے سے ٹکرانے کی انتظار کرنے لگتا ہوں۔ میں اس کے کسی بھی خط کا جواب کیا لکھتا، اتنا بھی نہیں لکھ سکا کہ ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ بس سیلی سیڑھیوں کی تاریکی میں دبکے ہوئے میں نے ساری بھوکوں کو کتابوں میں لپیٹ لیا اور "میورسال" کی انگلی پکڑ کر چلنے لگا۔

"تمہیں یاد کرکے ایک دن ہم بہت ہی ہنسے!" پڑوس کی بڑھیا کہہ رہی تھی۔ "تمہارے جانے کے بعد ہم نے اسے لڑکیوں کا سٹور بنا لیا۔ مگر اس میں ہماری لڑکیاں بھی پوری نہ آپائیں اور تم نے دو برس کاٹ لئے۔"

جی چاہا، کوٹھڑی کو دھوں دھوں جلا دوں۔ اس کونے میں کتنی خوبصورت

نظمیں پڑی تھیں۔ غیر ملکی کتابوں کے کرداروں کے ساتھ گھنٹوں باتوں میں لگا رہتا۔ دیواروں پر کتنی سطریں لکھی تھیں--- "اے مین از تھنگ ایلس بٹ وہٹ ہی مسکس آف ہم سیلف" چپے چپے پر نظمیں درج کی تھیں۔ موم بتی کے اجالے میں لگتا جیسے شعر دیوار پر تیر رہے ہوں' چوٹے چھوٹے شعروں کی ناویں....

"بڑی گندگی تھی۔ تم نے بیٹا! نہ جانے کیا کیر کانٹے بنا بنا کر دیواریں کالی کی تھیں!"

جی چاہا' ناخنوں سے کھرونچ کر ان لفظوں کو چوم لوں جو میری آنکھوں کے سامنے آج بھی ناؤوں کی طرح تیر رہے ہیں۔ یہ کون ہوتے ہیں....؟

"مگر میں کون ہوں؟ میں تو اس کونے کا کرایہ بھی نہ دے سکا تھا!"---- لڑکھڑاتے قدموں سے باہر آیا جیسے بدن کا ایک حصہ اس تاریک کونے میں کھو گیا ہو----

نئے بنے ہوسٹل میں رکشا رکا۔ کمرے کی چابی لے کر اندھیرے قلعے ایسے ہوسٹل میں نمبر تلاش کرنے لگا۔ دوسری منزل پر ایک کمرہ کھولا۔ خالی اور سنسان کمرے میں کھڑے ہو کر ایک لمبا سانس بھرا---- اور خالی دیواروں کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ تبھی کلرک بولا---- "آپ کا کمرہ بی بلاک میں ہ' اے بلاک میں نہیں!"

بی بلاک---- کمرہ خالی کرنے والا عجیب سے ہندسے اور حروف بکھیر گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بیکار کی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ پھٹے پرانے اخبار' شمپو کی خالی بوتلیں' فیوز ہوئے بلب' جوتوں کا خالی ڈبہ' مستعمل بلیڈ' بے سیاہی کے دوات اور خطوط کے پھٹے ہوئے پرزے----

اپنے آپ میں مجرم سا محسوس کیا جب تین برس بعد یہی کمرے میں چھوڑ کر ہوسٹل کے باہر آیا۔ رکشا میں بیٹھتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے لگا جیسے ابھی میں نے سامان رکشا سے اتارا ہی نہ ہو---- اور تین برس جیسے زندگی سے منفی ہوگئے ہوں---- تین برسوں کا حاصل؟

آدھی رات کے وقت ہم دونو اپنے کمرے کو لوٹے---- دلی جیسے خاموشی کا پہاڑ بنی محو خواب تھی۔

"تمہارے گھر میں پانی پینے کے لئے گلاس بھی نہیں---"

"یہ سامنے بیئر کی خالی بوتل ہے۔"

"کوئی پلیٹ؟"

"یہ اخبار حاضر ہے!"

ہم نے ڈھابے سے لائی ہوئی روٹی کو اخبار پر بچھا کر رکھا---- تو لگا جیسے دل کے ایک خالی کونے میں نغمے جیسا پیڑا گ رہا ہو۔

اور پھر کچھ دن بعد فلم انسٹی چیوٹ میں ٹریننگ کے دوران ہم نے پربھات سٹوڈیو کے پرے پار چھوٹی سی پہاڑی کے پاؤں میں ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ سامان کے نام سے صرف دو اٹیچی کیس اور چند برتن تھے۔ اور آدھی تنخواہ کرائے میں چلی جاتی تھی۔ تاہم یوں لگتا تھا گویا زندگی کے کتنے ہی برس ہم اس گھر کے لئے بھٹکتے رہے تھے----

اور اب بھی جب ہم دونوں باتیں کرتے ہیں تو اکثر اپنے خوابوں میں بسے ہوئے گھر کے بارہ میں---- چھوٹے چھوٹے خرچوں میں جب ساری تنخواہ نپٹ جاتی ہے' تب---- میرے ہاتھوں کو کس کے دبا کر وہ کہتی ہے---- "مجھے کچھ نہیں چاہئے---- مجھے ٹی وی یا صوفوں کا شوق نہیں ہے---- صرف نقرئی گھنٹیوں والا پلنا چاہئے' اپنی بچی کے لئے----!"

میں جب بھی اپنے نئے گھر کا تصور کرتا ہوں تو اس کا ایک حصہ پگھل کر اندھیرا' سیلا' سیڑھیوں کے نیچے کا کونہ بن جاتا ہے----

گل چوہان 1950

کمرے سے گھر اور گھر سے کمرے تک کے سفر میں جب کمرہ تھا تو میں اس میں گھر تلاش کرتا رہا' اور جب گھر تھا تب اس میں اپنا کھویا ہوا کمرہ ڈھونڈتا رہا۔

درحقیقت میں اپنی پیدائش 1950ء میں نہیں' 1970ء میں مانتا ہوں کیونکہ ان بیس برسوں کا کچھ بھی مستند میرے پاس نہیں ہے جو اس طویل عرصے کا چشم دید بن سکے۔ اگرچہ یہ بھی سچ ہے' جو میں آج آپ سے کہہ رہا ہوں' اس کا بہت کچھ ان بیس برسوں کی ہی جمع باقی ہے۔ خیر----

میرا پہلا کمرہ میرے اور مختار گل کے اشتراک میں تھا۔ اس کے بعد پرتس نگر کا کمرہ' اس کے بعد شریف پورہ والا' اور اب یہ---- جو ان کمروں کے بعد بھی ہے اور پہلے بھی تھا---- 577' ایلٹ موہن نگر۔+ گیٹ پر میرے والد کی نیم پلیٹ کے ساتھ لیٹر بکس----

کہیں سے آتا ہوں تو سب سے پہلے چٹھی دیکھتا ہوں یا اپنے پانچ سال کے بچے کے توتلے بول کا انتظار کرتا ہوں---- "گل پاپے کوئی آیا----" تاکہ جتنی زمین تالستائے نے انسان کی ضروری بتائی تھی' کہیں اتنی ہی میرا نصیب نہ ہو جائے----

کتنے خطوط کے بعد بھی اس خط کا انتظار ہے---- کتنے لوگوں کے بعد بھی اس انسان کا انتظار ہے----

کبھی کبھی کوشش کرتا ہوں' اس کمرے سے کہیں بہت دور جاؤں۔ اور جا کر پھر اس کمرے کے لئے دل تڑپ اٹھتا ہے۔ یہ کمرہ کچھ دن دل کے بکھراؤ کو سمجھالتا

سنوارتا ہے۔ مگر سفر کا سحر ٹوٹتے ہی دیواروں کی جکڑ جیسے ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ پل پل بڑھتی بیگانگی' ایک وقت آیا ہے' برداشت کے باہر کی شے ہو جاتی ہے۔ اک غریبی سی چاروں طرف گھر آتی ہے اور ایک احساس تم یہاں کس لئے ہو؟ تم اتنے بے حس ماحول میں ہو ہی کیوں؟---- پھر ایک سفر شروع ہوتا ہے' پھر دوسرا' پھر---- تیسرا---- پھر واپسی---- واپسی---- واپسی! جانے اور لوٹنے کا اک سلسلہ لامتناہی! اس سلسلے کا ہی شاید ایک سفر وہ بھی ہوگا جب میں اس کمرے کے دائرہ کشش سے نکل جاؤں گا' خلا میں---- اس کمرے سے' اس دنیا سے دور' کسی دوسری دنیا' کسی دوسرے کمرے کے لئے۔ ہاں نہیں' سچ جھوٹ' بھلے برے' اپنے پرائے کے آسان اور سطحی بٹوارے سے آزاد ہو کر کسی تیسرے سچ کے لئے----

پل پل بڑھتی بیگانگی برداشت سے باہر کی چیز ہو جاتی ہے تو شعر نکلتا ہے' پھر کوئی رنگ' پھر کوئی چہرہ' پھر کوئی غم---- جب تک شعر بوڑھا نہیں ہوتا' جب تک شعر میں جان ہے----

اگر موسم ایسا ہی رہا تو ایک دن آئیگا جب شعر بوڑھا ہو جائیگا' زندگی بجھ جائیگی اور یہ کمرہ ایک قبر بن جائے گا۔ جب کوئی رنگ یا چہرہ نہیں رہے گا' صرف آوازیں رہ جائیں گی۔ ہوا جیسے نیم مردہ پانی ہو اور الفاظ جیسے مری ہوئی مچھلیاں!

پریت نگر نے مجھے کمرہ بھی دیا اور گھر بھی!

کمرہ گھر میں تبدیل ہوگیا تھا اور گھر---- یاد آتا ہے' میری بیوی بیس پچیس فراک ہینگروں میں اڑس کر کمرے کے آر پار بندھی ہوئی رسی پر لٹکا دیتی ہے۔ دیو پینٹنگ ان فراکوں کے پیچھے چھپ جاتی ہے۔

"یہ گھر ہے یا ڈرائی کلیننگ کی دوکان؟"---- اور وہ میں ہی تھا جس نے سنا تھا---- "تم نے یہ سب بنا کر دیئے ہیں کیا؟ "پھر ایک دن---- انگیٹھی پر رکھے چوکٹھوں میں سے امرتا' اجیت کور اور شبانہ اعظمی غائب ہیں' ان کی جگہ پر میری بیوی کی غیر ملک کی بہنوں اور بھائیوں کی رنگین تصاویر لگی ہیں۔

ہم ان دنوں پریت نگر میں رہتے تھے۔ میں سکول سے لوٹ کر دروازہ کھٹکھٹاتا ہوں۔ اندر سے کچھ بول سنائی دیتے ہیں جو ایک بیوی، صرف اپنے خاوند سے کہہ سکتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں۔۔۔۔ "تم دروازے کھولنے سے قبل ہی کیسے جان لیتی ہو کہ یہ میں ہی ہوں؟"

اس نے مجھے دروازے میں ایک چھید دکھایا جس میں سے باہر کا صرف تھوڑا سا اک نقطہ دکھائی دیتا تھا۔۔۔۔ "میں اس میں سے دیکھ لیتی ہوں۔ تمہاری قمیض دکھائی دیتی ہے جو تم صبح پہن کر گئے ہوتے ہو۔"

"صرف قمیض؟"

میں نے پریت نگر چھوڑ دیا تھا۔ پھر 577ء ایسٹ موہن نگر! واپسی کے دوسرے دن ہی کچھ ایسا لگا جیسے بیاہی گئی لڑکی اپنے میکے آکر دروازے اور کھڑکیا پہلے سے استحقاق کے ساتھ نہیں کھول سکتی۔

ایک پاکستان بن جانے کے بعد جیسے اس کے برابر کتنے ہی پاکستان بنا لینا میری ضرورت بن گئی تھی تاکہ غم ٹکڑہ ٹکڑہ بٹ جائے۔ سو میں نے اسی شہر میں کرائے پر کمرہ لے لیا۔ بستی کا نام شریف پورہ تھا۔ میرا کمرہ سہ منزلہ مکان کی درمیانی منزل میں تھا۔ نیچے مالک مکان' اوپر کنڈکٹر۔۔۔۔ نیچے مالک مکان کی نوجوان لڑکی کوئی بکواس جیسا گیت زور زور سے گا رہی ہوتی اور اوپر کنڈکروں نے کوئی چالوسی لڑکی کمرے میں گھسائی ہوتی۔۔۔۔ دیکھنے والا کہتا' یہ کمرہ ہے یا کوٹھا؟

"کہاں سے آئے ہو؟۔۔۔۔ کیوں آئے ہو؟۔۔۔۔ کہاں چلے ہو؟" مجھے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہ احمقانہ قسم کے سوال جن کا جواب آدمی آج تک نہیں ڈھونڈ سکا۔ گھر تھا تو پٹی میں ایک مشاعرے میں نظم پڑھ کر آیا تھا۔ نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا شعر کچھ اس طرح تھا کوہ لوگ کہتے ہیں' اخبار پڑھا کرو۔ اس میں اپنے ملک اور غیر ملکوں کی خبریں ہوتی ہیں۔ مگر میں نے دو گھنٹے برباد کر دیئے۔ یہ چھوٹی سی خبر بھی نہیں ملی کہ ہمارے گھر میں کل رات کھانا نہیں بنا تھا۔۔۔۔ گھر لوٹا تو والد پورے کے پورے دہشت بنے کھڑے تھے (انہیں سی آئی ڈی کے کسی رپورٹ

نے بتا دیا تھا) وہ میرا ہی انتظار کر رہ تھے--" کتے کے بچے! تو لوگوں سے کہتا پھرتا ہے' گھر میں کھانا نہیں پکتا جب تجھے کھانے کو مرغے ملتے ہیں؟ کیا نہیں ملتا تم لوگوں کو؟ نکل جا میرے گھر سے! اٹھا اپنا سامان" اور وہ میرا سامان باہر پھینکنے لگے---- "یہ جاتا ہے تیرا گورکی---- یہ جاتا ہے تیرا چیخوف---- یہ جاتا ہے تیرا----" اور کتابیں ایک کے بعد ایک صحن میں بکھر رہی تھیں۔

اور پھر وہ رو رہے تھے---- "تو اسی لئے پیدا ہوا تھا----؟" اور---- میں سوچ رہا تھا---- میں اس لئے تو پیدا نہیں ہوا تھا---- اور پھر میں پریت نگر آگیا تھا۔ سوچتا ہوں' ایک کمرہ ہے---- وسیع' سرسبز پس منظر میں لٹکا ہوا' نیلگوں کمرہ۔ ایک آدمی اس کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ کچھ ثانیوں کے بعد جب وہ آدمی باہر جاتا ہے تو وہ آدمی وہ نہیں ہوتا' عجیب طرح سے بدل چکا ہے۔ کسی کی ایک ٹانگ لمبی ہو جاتی ہے' کسی کی ناک بڑھ جاتی ہے' کسی کی ایک آنکھ اس کے چہرے پر پھیل جاتی ہے۔

کہیں سے آواز آتی ہے---- "مسجد کا موذن روز مرے! تھانیدار کی عمر دراز ہو----"

ایک خاموش' زمردیں خلاء میں لٹکتا ہوا نیلگوں کمرہ---- میرا کمرہ' جس میں سے گزرنے والا انسان وہ نہیں رہتا جو وہ داخل ہوتے وقت تھا۔ باہر نکلنے والے انسان کی بدلی ہوئی صورت سے مجھے خوف بھی آتا ہے۔ سوچتا ہوں' یہ آدمی اس نیلگوں کمرے کا اشتہار ہو جائیگا----

شاید یہ کمرہ بھی میرا نہیں ہے۔ اس میں میرے یاروں کے کمرے بھی زندہ ہیں۔ سوچتا ہوں' مجھے اس شخص کا ہی انتظار ہے جو اس سرسبز خلاء میں لٹکے ہوئے کمرے سے گزرتے ہوئے اپنی پہلی شبیہہ رکھ سکے' بدل نہ جائے۔

ہتو' میرا بچہ کہے گا---- "گل پاپے' غبارے تو وہی ہوتے ہیں۔ ایک بیچنے والا آتا ہے تو کہتا ہے' گیس کے غبارے لے لو۔ دوسرا کہتا ہے۔ ہوائی غبارے لے لو----

یا جب وہ مجھے رنگوں سے "پاپلی پاپلو بنا کے دکھائے گا--- "یہ بہت خوبصورت ہے۔ اسے دیوار پر لگا دو!" یا وہ میرے بازو پر پڑا ہے اور کہانی سننے کی ضد کرتا ہے۔

"ایک خرگوش تھا۔ سویرے اٹھتا تھا۔ برش کرتا تھا۔ سکول جاتا تھا۔ سکول جا کر پڑھتا تھا---"

"پڑھ کر کیا ہوا؟"

"بیٹے! پڑھ پڑھ کر وہ انجینئر بن گیا۔"

"انجینئر کیا ہوتا ہے؟"

"بیٹے! انجینئر وہ ہوتے ہیں جو سڑکیں بناتے ہیں، مشینیں بناتے ہیں، گاڑیاں بناتے ہیں، کار بناتے ہیں---"

"رنگوں سے؟"

---- وہ بیمار ہے۔ کچھ عجیب سا بڑبڑا رہا ہے اور تیز بخار سے تپ رہا ہے۔ "نہیں، اسے کچھ نہیں ہونے جا رہا ہے!" میں بار بار اپنا اعتقاد پکا کرتے ہوئے اس کی نبض دیکھتا ہوں---- میں جاگ رہا ہوں---- کچھ غلط نہ ہو جائے، اس سے ڈر رہا ہوں----

---- ٹی وی چل رہا ہے۔ ہتو میری گود میں بیٹھا ہے۔ سکرین پر ایک بچہ گا رہا ہے۔ میں اس کو جوش دلانے کے لئے کہتا ہوں۔ "بیٹے! دیکھو، کتنا اچھا گا رہا ہے!" وہ چپ ہے۔ میں کہتا ہوں "بیٹے! دیکھو، اسے سن کر خوبصورت لڑکیاں تالیاں بجا رہی ہیں، دیکھو!" وہ پھر بھی چپ ہے۔ کوئی رد عمل نہیں۔ مگر کچھ دیر بعد وہ پوچھتا ہے---- "گل پاپے! اس کی ممی ہے؟"

---- اک چھوٹی سی دنیا ہے، ایک طلاق شدہ مرد، اک بن ماں کے بچے کی۔ اور اس میں---- خاموشی ہے، انتظار ہے، خواب ہے----

مجھے اپنے کمرے سے شکایتیں بھی ہیں جیسے کہ ڈوبتا ہوا سورج اونچے اونچے مکانوں کے پیچھے چوروں کی طرح چھپ کیوں جاتا ہے، سب کے سامنے سمندر میں

کیوں نہیں ڈوبتا؟ جیسے کہ دروازہ کھٹکھٹانے والا شخص وہ کیوں نہیں ہوتا جس کا مجھے انتظار ہوتا ہے؟ جیسے کہ جب میں چاہوں' یہ باتیں کرے' کوئی کہانی چھیڑے' یہ پتھر کیوں بن جاتا ہے؟ جیسے کہ میں اس کے لئے کچھ بھی نیا کروں' کچھ عرصہ بعد اپنا وجود کیوں کھو بیٹھتا ہے؟ جیسے کہ جب بھی میں اس میں ایک سلیقہ لاتا ہوں' کچھ وقت کے بعد یہ سٹور کی صورت کیوں اختیار کر لیتا ہے؟

بیبا بلونت کے کمرے میں لگی ہوئی حسین دوشیزاؤں کی پینٹنگز کے گرد میں نے جو لمحے اکیلے بتائے ہیں' میں چرا لانا چاہتا ہوں۔

جو باریک سا پل میں نے امرتا اور امروز کے بیچ کے فاصلے میں چمکتا ہوا دیکھا ہے' میں چاہتا ہوں' اسی جیسا ایک پل میری بھی تقدیر بن جائے۔

ویسے تو یہ بھی سوچ رکھا ہے کہ کوئی بھی کمرہ ہو' ایک نہ ایک دن مجھے وہاں سے ضرور گورنی' چیخوف اور اپنے افسانوں سمیت جلا وطن ہونا پڑے گا یا جلا وطن کر دیا جاؤں گا---- بس کہیں بھی' بس کبھی بھی' پتہ نہیں کہاں۔ کس وقت----

دل سلسلہ واقعات و حوادثات میں سے منفی ہو گا اور خاموش' زمردی خلاء میں بھٹک جائیگا۔

پیشتر اس کے کہ پاؤں میں سے جڑیں نکل کر مٹی سے کوئی سازش کرنے لگیں' آگے بڑھ کر چلنا ہے۔ حسرت تو بہت ہے کہ ایک پیڑ کی طرح اگا جائے' سورج کو سبز رنگ سے پینٹ کیا جائے۔ ہوا میں سے کوئی خوشبو لے کر اسے کوئی نام دیا جائے' زمین کی کشش ثقل کو پورا اعزاز دیا جائے۔ مگر نہ جانے کیوں' بن چکے پاکستان کسی بھی سرزمین کے ٹکڑے کو اپنا ملک نہیں سمجھنے دیتے----!

کشمیر سنگھ پنوں 1950

کمرے کا خیال آتے ہی یوں لگتا ہے کہ ابھی کوئی پکا بل نہیں ہے۔ سانپ کی طرح کینچل اتار کر کئی جھاڑیوں میں چھوڑ آیا ہوں۔ اور پھر ماضی کے پرزم میں جھانکنے پر کئی کمرے آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔ الجھن ہوتی ہے کہ کون سے کمرے کے بارے میں لکھوں؟ مگر کچھ نہ بھولنے والے کمرے یادوں میں نمایاں ہو کر لکھنے کے لئے اکساتے ہیں۔

سن ۱۹۵۰ء میں نومبر کی ۳ تاریخ کو مرغ کی بانگ کے قریب تین گھنٹے پہلے دنیا کو دیکھنے کے لئے میں نے آنکھ کھولی تھی۔ ہوش سنبھالنے پر ماں نے بتایا تھا کہ میں ننھال میں ایک تاریک کوٹھڑی میں اس وقت پیدا ہوا تھا جب اس کوٹھڑی کی کچی دیوار میں پچھواڑے کی طرف سے چور سیندھ لگانے میں مصروف تھے مگر وہ رونے کی آواز سن کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ اس معجزہ نما واقعہ کی وجہ سے صبح نانا نے محلے میں لڈو بانٹے تھے اور خوشی میں بھنگڑہ ڈلوایا تھا۔ گاؤں کے لوگ کہہ رہے تھے---- اگر پہلوان میاں سنگھ کے گھر رات کو دوہتا نہ آیا ہوتا تو چور سب چھ لوٹ پاٹ کر لے جاتے۔ تبھی تو نانا میری آغاز شباب کی غلطیوں کو ہنس کر معاف کر دیا کرتے تھے۔ میں دل ہی دل میں اس کوٹھڑی کا شکریہ ادا کرتا رہا ہوں.....

بچپن میں جب ہم تم ریت سے گھر گھر بنانا کھیلتے تھے' تب ایک لڑکی بڑے نخرے سے کہا کرتی تھی---- "کبھی ریت کے بھی گھر ہوتے ہیں؟ یہ گر جاتے ہیں---- میں تو کوئی بڑھا گھر بناؤں گی' اور اس میں سب س اچھا کمرہ میرا ہو گا۔" ایسے ہی جب اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ سٹاپو کھیلتے اور ٹیڑھی میڑھی لکیریں مٹا کر

نئے سرے سے گھر بناتے' تب ذہن میں غیر شعوری طور پر کسی گھر کی تصویر کئی بار بنتی اور مٹ جاتی' سٹاپو کی ٹیڑھی میڑھی لکیروں کی مانند---- نہال کی حویلی والے اس کمرے کی یاد بھی مجھے اب تک کریدتی ہے۔ ان دنوں سردی کے موسم میں جب ہم سن کے تنکوں کی سگرٹیں بنا کر ایک دوسرے کے منہ پر دھواں پھینکتے تھے تو پاس بیٹھا ہوا لنڈا مزارعہ آگ تاپتا ہا حقے س گڑ گڑ کی عجیب و غریب آوازیں نکال رہا ہوتا تھا۔ ایک بار اس کے حقے میں سے میں نے بھی چوری چھپے سر نکالنے کی ناکام کوشش کی تھی تو پھندا لگنے کی وجہ سے آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔ اسی طرح پرائمری سکول کا وہ کمرہ بھی یاد سے نہیں مٹا جہاں مجھے اپنی برادری کے ماسٹر نے مرغا بنا کر بانس کے ٹوٹے ہوئے سوٹے سے مارا تھا اور پنکھے کی کھڑکھڑ کی پرشور آواز میں میری چیخیں ڈوب کر رہ گئی تھیں۔ میرا قصور صرف اتنا تھا کہ کسی اور ماسٹر کے لڑکے نے مجھے کسی بات پر گندی گالیاں دی تھیں اور میں نے بدلہ لینے کے لئے اس کی تختی پر ماں بہن کی موٹی موٹی گالیاں لکھ دی تھیں۔

اسی طرح بچپن سے جوانی کی طرف بڑھتے ہوئے کانگڑہ ضلع کے زون کیمپ کے ایک کمرے میں بیٹھ کر جب میں بلند آواز سے سبق رٹ رہا ہوتا تو اڑتے ہوئے بادل کبھی کبھی کمرے کے اندر گھس آتے اور کتاب بند کرنے کا مجھے عمدہ بہانہ ہاتھ آ جاتا۔ تب ہی تو وہ پہاڑوں کے پاؤں میں بسا ہوا کمرہ اچھا لگتا تھا کیونکہ وہ مجھے پڑھنے سے چھٹکارا دلا دیتا تھا۔

۱۹۶۵ء کی بھارت پاک جنگ کے دوران بلیک آؤٹ کے وقت میں نے الگ کمرے میں منہ سر لپیٹ کر' چھوٹی بیڑی جلا کر کے' گھر والوں سے چھپا کر ایک بار جنگ پر طنزیہ مضمون لکھ کر اخبار کو بھیجا جسے چھپنے پر اپنی جماعت میں فخر سے دکھایا۔ مگر ماں نے مجھے بیلن سے پیٹا تھا کہ میں نے رات کو روشنی کر کے سب کو مروا دینا تھا۔ اس مار کا نشان ابھی بھی میری داہنی ٹانگ پر موجود ہے اور آج بھی وہ کمرہ ایک داغ کی صورت میں میرے پاس ہے۔ جنگ ختم ہونے پر میں اپنے آبائی گاؤں میں آ گیا تھا۔ ایک ہی لمبا کمرہ تھا۔ مٹی کے تیل کی روشنی میں پڑھنے کے لئے مجھے باورچی

خانہ ملا ہوا تھا جو میرا کمرہ بھی تھا۔ پڑھتے وقت باورچی خانے سے جب کبھی ڈبے میں سے لذت افروز مہک آتی تو ڈرائینگ کی پرکار اس کا تالہ کھولنے کے مصرف میں آتی۔ دیئے کی روشنی دیوار پر چمکنے اور بجھنے سے ایک لڑکی اندازہ لگا لیتی تھی کہ میں کب سویا۔ اس کمرے سے مجھے اس وجہ سے بھی انس تھا کیونکہ مجھ سے آورش قسم کا عشق کرنے لگی تھی۔

دسویں کے بعد آبکاری کے دفتر میں ملازمت مل گئی۔ اسی محکمے کا ایک کارکن میرا روم میٹ بنا۔ ان دنوں میں شراب کو چھوتا تک نہ تھا۔ لیکن وہ اور اس کا ایک مریل سا دوست مفت کی پی کر خرمستی کیا کرتے تھے۔ کمرے میں میرے روم میٹ نے موچنا، قینچی اور بازوؤں کے ڈولے (مچھلیاں) بنانے والا بل ورکر رکھا ہوا تھا جس سے وہ صحت بناتا تھا۔ وہ دودھ لے کر الگ رکھ لیتا تھا جو اکثر صرف بلی کے کام آتا۔ وہ پندرہ پندرہ دن کے بعد بازوؤں پر باندھے ہوئے دھاگوں کو دیکھا کرتا کہ ان کے نشان پڑے ہیں یا نہیں۔ اسی کمرے میں میرے روم میٹ نے ایک حسین لڑکی کی نیم عریاں تصویر لٹکا رکھی تھی جس کے حسن کو مکھیوں نے بگاڑ دیا تھا۔ ساتھ ہی ہنومان کی بھی ایک تصویر تھی۔ جس کے آگے وہ کسرت کرنے سے پیشتر دھوپ جلایا کرتا تھا، نہ جانے کیوں؟ اسی کمرے میں انڈوں کے خول ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے سپنے بھی ٹوٹتے تھے۔ اس کا مجنوں دوست چوڑیوں کے ٹکڑوں کو گھور کر دیکھتا اور پھر ان کو اپنی جیب میں رکھتے ہوئے اک سرد آہ بھرتا---- مجھے اس سب کچھ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جلد ہی میں اس ماحول کو خیرباد کہہ کر چندی گڑھ آ گیا۔ کمرے میں اکیلے رہتے ہوئے جب بلب کی روشنی دیوار پر پڑتی تو گاؤں کے دیئے والا واقعہ مجھے اس لڑکی کی یاد دلاتا۔ اس کی شہد سے بھی میٹھی چٹھیاں پڑھ کر سینے سے لگائے ہوئے کئی بار کمرے میں پاگلوں کی طرح باتیں کرنے لگتا تھا۔ مگر میرے آورش سپنوں پر اس کی بیوفائی نے ایسا پانی پھیرا کہ مجھے وہ کمرہ کاٹ کھانے لگا۔ ذہنی طور پر میں بہت کچھ اوٹ پٹانگ سوچتا تھا۔ پھر مجھ پر ایک سنک سوار ہو گئی۔ مانگ کر لئے ہوئے کمروں کے مناظر کو یاد کر کے اب بھی

مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ صرف وہی کمرہ میں دانستہ طور پر لیتا تھا جس کے دو دروازے ہوتے تھے---- ایک کو باہر سے تالہ لگا کر دوسرے کو اندر سے چٹخنی لگا کر بے فکر ہو کر مزہ لوٹتا تھا۔ اس کمرے میں ہمارے تیز سانسوں اور چوڑیوں کی کھنک کی آواز دیواریں ضرور سن لیتی تھیں۔

انہی دنوں ہمارا سارا خاندان چندی گڑھ آ گیا۔ پھر بھی گھر کے افراد کے ساتھ رہتے ہوئے' والد کی کھردری آواز' بچوں کی چیخ چلاہٹ' برتنوں کی کھنک' تڑکے کی چھینکوں کے درمیان چھوٹے سے کمرے کے ایک کونے میں ایک ہلنے والی کرسی پر بیٹھ کر سابق کی مانند ہی میں نے پڑھنا لکھنا جاری رکھا۔ باہر کی طرف کھلنے والے دریچے سے جب میں آسمان کی طرف دیکھتا تو محو پرواز پرندے مجھے اچھے لگتے۔ میں ان کمروں میں اپنے تئیں غلام سمجھتے ہوئے بھی آدھی آدھی رات تک پڑھتا اور گھر والوں کی نیند خراب کرتا رہا۔ میں اپنی مرضی کی شادی کروا کر الگ رہنا چاہتا تھا۔ جہاں میری کتابیں ہوں اور وہ! تبھی تو سگائی کی بات پکی ہونے پر اس نے ہنس کر کہا تھا---- "آج کے بعد تمہاری ایک نہیں' بہت سی سوتنیں ہوں گی!" تب وہ حیران اور الجھی الجھی سی میری طرف دیکھنے لگی تھی۔ مگر اسے الجھن سے نکالنے کے لئے میں نے وضاحت کی تھی---- "کمرے میں بھری کتابیں تمہاری سوتنیں ہوں گی!" لیکن شادی کے بعد کمرے کو سجانے اور آراستہ کرنے کا جو خواب دیکھتا تھا' وہ حقیقت نہ بن سکا۔ سر کے ایکسیڈنٹ کے باعث راجندر ہسپتال' پٹیالہ کے ایک کمرے میں میری ٹانگوں کو رسیوں سے باندھا گیا تاکہ میں ایڑھیاں بھی نہ رگڑ سکوں۔ اور سرجری کے ماہر ڈاکٹر اجمیر سنگھ نے بہت ہلکے ہاتھ سے آپریشن کر کے مجھے موت کے منہ سے نکال کر باہر کی دنیا دیکھنے کے قابل بنایا تھا۔ جب راضی ہو گیا تو اس ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرنے کے لئے پھر ہسپتال گیا اور اس کمرے کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا جہاں مجھے دوسری زندگی ملی تھی۔ وہاں پڑی ہوئی کئی چیزوں کو چھوا۔ اس پانی کی ٹونٹی سے اوک سے پانی پیا کیونکہ بیماری کی حالت میں نہ بولنے کی وجہ سے گونگوں کی طرح اسی ٹونٹی سے پانی پینے کے لئے

اشارہ کیا کرتا تھا۔ آتے وقت بھی میں اس کمرے کو مڑ مڑ کر محبت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا تھا.....

موجودہ رین بسیرا موحال میں' دریا کے کنارے' قدرت کی آغوش میں ہوتے ہوئے بھی' ایک کم تیس سال کی عمر ہونے پر بھی کمرے کو اپنا کہنے کی بات نہیں کہہ سکتا۔ مجھ سے پہلے ان کمروں میں دو جنے رہتے تھے۔ جنہوں نے یہ کہہ کر مکان لیا تھا کہ ان کی بیویاں اپنے مائکے گئی ہوئی ہیں---- وہ کبھی بھی مائکے سے نہیں آئیں۔ اور ایک رات وہ چپکے سے گھر چھوڑتے وقت مہینے کا کرایہ تو مار ہی گئے' ساتھ یہ پیتل کی ٹونٹیاں بھی نلکوں سے اتار کر لے گئے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پانی گورو کے لنگر کی طرح لگاتار بہتا رہا۔ اس مکان کے کمروں میں طرح طرح کی تصویریں لگی ہونے کے علاوہ غسل خانے میں کالجوں کے غسل خانوں کی طرح بہت کچھ فحش لکھا ہوا تھا جو بد میں ہم نے مٹایا۔ کہنے کو تو یہ دو کمروں کا سیٹ ہے' لیکن اگر بیچ کی دیوار ہٹا دی جائے تو اس کا طول و عرض ایک عام کمرے سے زیادہ نہ ہو گا۔ اسی وجہ سے گھر کے لتے پتے کو ٹھیک سے رکھنے کے لئے بیگم نے میری کتابوں والی ریک میں جوتے رکھ دیئے ہیں۔ جب مجھے کسی کتاب کی ضرورت پڑتی ہے تو بڑی دقت ہوتی ہے۔ روشن دان کے تڑکے ہوئے شیشے میں سے جب برسات کا پانی ٹپ ٹپ دیوار کے ساتھ بہتا ہوا نیچے کتابوں تک آتا ہے تو ہم دونو کتابوں کو پلنگ پر بکھیرتے ہوئے بڑے عجیب لگتے ہیں۔ دھوپ نکلنے پر صحن میں کتابوں کو سکھانے کے لئے جب چارپائیوں پر بچھاتے ہیں تو وہ کسی نمائش سے کم نہیں لگتی ہے۔ صبح جب اخبار پڑھنے میں مصروف ہوتا ہوں تو دوسرے کمرے میں دھوپ جلا کر میرے لڑکے سنی کو اس کی ماں مانجھا ٹیکنے کے لئے کہتی ہے۔ وہ مجھے بھی اشارہ سے ایسا کرنے کو کہتی ہے میں مذہب پرست نہ ہوتے ہوئے بھی بیگم کو خوش کرنے کے لئے ان مٹے دل سے تصویر کے آگے پٹکا باندھے سر کو جھکا دیتا ہوں۔ جب کچھ لکھ رہا ہوتا ہوں تو میرا لڑکا پین لے کر عجیب کیل کانٹے بناتا ہے اور جب دل بھر جاتا ہے تو پین واپس کر دیتا ہے۔ جتنی دیر تک وہ "لکھنے" میں مصروف رہتا ہے' میں

بیگم کی طرف دیکھ کر جو گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر روئی کے پھول بناتی اور کانٹے دار جھاڑیوں پر ٹانکنے کا پلائی پر سجاوٹ کے لئے کشتی بنانے کا کام کر رہی ہوتی ہیں' خوش ہوتا ہوں اور ان کے سجاوٹ کے کام کی تعریف کرتا ہوں۔ جب سنی اور اس کی ماں سو جاتے ہیں تب میں آزادی سے الٹا سیدھا لیٹ کر پڑھتا ہوں۔ میرے دائیں بائیں کتابیں بکھری رہتی ہیں۔ جب تازہ ہونے کے لئے میں باہر دیکھتا ہوں' رنگ برنگی کوئی پتنگ اڑتی ہوئی نظر پڑ جاتی ہے یا کسی چھت پر بال سکھاتی ہوئی کوئی دوشیزہ جب کسی تحریر کے چھپنے کی منظوری کی چٹھی آتی ہے تو اس کمرے میں بکھری ہوئی چیزیں بھی اچھی لگتی ہیں۔ چٹھی کو کئی بار پڑھتا ہوں اور کبھی کبھی بانسری بھی بجاتا ہوں جس پر ایک ہی گیت گانا سیکھا ہے---- "سو سال پہلے مجھے تم سے پیار تھا....." کئی بار اس سریلی تان میں پڑوسیوں کا شور بھی شامل ہو جاتا ہے۔

اس کمرے میں رہ کر بھی تن من دھن سے ان کا کچھ نہیں سنوار سکا۔ میرے خوابوں کا کمرہ سراب کی مانند وجود میں نہیں آ رہا ہے۔ بزرگوں کا قول یاد آتا رہتا ہے کہ سر پر چھت ضرور ہونی چاہئے۔ مگر ابھی تک دائمی طور سے کسی چھت کو اپنی کہنے کا اعزاز حاصل نہیں ہوا ہے۔ ہاں' کھلا آسمان ضرور ہے۔ جب بھی میرا اپنا گھر ہو گا تو ایک کمرے میں خاص طور سے کتابیں رکھنے کے لئے شیلف بنواؤں گا۔ لڑی دار موٹے منکوں والی دھاریوں کے آخر میں گھنگھرو ہوں گے جو دروازے میں پردے کی جگہ لٹکیں گے تب اندر باہر جانے پر ٹنکار کا جھنجھنا سا ترنم پیدا ہو گا۔ اب جب بھی مکان کا مالک مکان خالی کرنے کے لئے آ کر دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو دونوں کمرے غیر اور اجنبی سے لگنے لگتے ہیں اور میں "ٹو لیٹ" دیکھنے کے لئے نکل پڑتا ہوں جب "کرائے کے لئے خالی ہے" کا کوئی بورڈ نہیں دکھائی دیتا تو خوبصورت کوٹھیوں کے ڈیزائینوں کی طرف دیکھ کر سوچتا ہوں کہ کیا میرا بھی اسی طرح کا کوئی گھر ہو گا جہاں انگور کی بیلیں اور گدی دار گھاس اگاؤں گا اور چڑھتے سورج کی لالی میں شبنم موتیوں کی طرح چمکے گی۔ اپنے اس کمرے کو فنکارانہ ڈھنگ سے سجانے کی بات جب سوچ رہا ہوتا ہوں تو نوکری میں پڑا ہوا تالہ مجھے چڑا رہا ہوتا ہے کہ میں

بھی کن خیالوں میں شیخ چلی کی طرح پڑا ہوا ہوں۔ تبھی کہیں دور سے لٹکتا ہوا "ٹو لیٹ" کا گتا اسے لگتا ہے کہ اس گھر والا کمرہ میرا ہی کمرہ ہو گا۔ اور میں اس کمرے کو لینے کے لئے مالک مکان کو لبھانے والے فقرے کہنے کے واسطے موزوں الفاظ تلاش کرنے لگتا ہوں.....

کلدیپ جوشی 1952

الگ کمرے کی طلب مجھے بچپن میں ہی محسوس ہو گئی تھی مگر کرائے کے مکانوں میں رہتے ہوئے علیحدہ کمرے کی طلب بس طلب ہی رہ گئی تھی۔ صرف بیرکوں میں رہتے ہوئے ایک کوٹھڑی جیسے بعد میں مالک مکان نے کھول کر استعمال کرنے کی اجازت دی تھی، کسی حد تک اس کو میں اپنا کمرہ محسوس کرتا رہا ہوں۔ وہ میرا پڑھنے کا کمرہ بھی ہوتا تھا۔ وہاں میں نے ایک بار ایک پیڑ کی ٹہنی کی بندوق نما سی چیز بنائی اور سامنی دیوار پر لٹکا دی (یہ میں نے ایک شکاری کی زندگی اور اس کے کمرے سے متاثر ہو کر کیا تھا) بڑے بھائی نے وہ بندوق گھٹنے پر مار کر توڑتے ہوئے مجھے بھی اچھا چانٹا پلایا تھا---- اور یا پھر مکے والا ہمارا شکستہ سا چوبارہ میرا کمرہ بنا رہا ہے---- "اس" کو لکھے خطوط کی عبارت کا ہمراز!

۴۷ء کی بربادی میں نے نہیں دیکھی مگر اس کا احساس اپنی اٹھائیس برس کی عمر میں بہت بار ہوا ہے والد کی ملازمت نے بہت سے مقامات کا سفر کرایا..... اور ہر نئی جگہ جانے کے وقت میں باقی گھر والوں سے کچھ زیادہ ہی بجھا بجھا سا ہو جاتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم اجڑ رہے ہوں۔ میرے اندر اس "اجڑنے" کو برداشت کرنے کی قوت بالکل ہی نہیں رہی تھی۔ اور میں "ہجرت" سے کہ دن قبل اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں جا کر ٹھہر جایا کرتا تھا۔ مگر اب سب سے بڑا "اجاڑ" میں نے مکے سے آتے وقت محسوس کیا۔ وہاں میرا بہت کچھ تھا---- میری "وہ" تھی، یار "پالا" تھا اور میری "وہ" کے گھر کے سامنے والا جوہڑ تھا جہاں میں مویشیوں کو صرف اس لئے نہلانے لے جاتا تھا کہ "وہ" نظر آتی رہے۔

وہاں سے رخصت ہوتے وقت میں بہت رویا۔ ڈنگروں کو ہانک کر کچے راستوں سے ہوتا ہوا جب میں ترن تارن پہنچا تھا تو بخار سے میرا بدن تپ رہا تھا۔ بعد میں ادھار دی ہوئی گائے لانے کے لئے میں جب پھر اس گاؤں میں پہنچا تو اندر کا زخم پھر ہرا ہو گیا۔ تب میں نے زندگی میں پہلی بار شراب پی تھی، جی بھر کر! چیخیں مار مار کر رویا تھا۔ اور اپنے چوبارے پر چڑھ کر وہ سب کچھ تلاش کرتا رہا تھا جو یہاں رہتے ہوئے کبھی ہوا کرتا تھا۔

ترن تارن میں رہتے ہوئے مجھے اپنے کمرے کی طلب انتہائی شدت سے محسوس ہوئی۔ یہاں میں نے گھر والوں سے الجھ کر اپنا علیحدہ کمرہ لے لیا تھا جو زندگی کے کئی برس میری جائیداد بنا رہا۔ اس کمرے میں ایلین جیسے ساتھی کی صحبت کا بھی لطف اٹھایا، جسبیر بھلر کے بول بھی سنے، بلجیت آہوجہ کے لڑکھڑاتے قدموں کی چال بھی دیکھی، سرجیت (مجسٹریٹ)، بلبیر، کرشن، سوز اور سنیل ابرول کی کھنکتی ہنسی کو بھی سنا اور کچھ لمحوں کا ساتھ گل چوہان کا بھی جیا۔

تعجب کی بات ہے کہ میں غار نما کمرے سے کیسے جڑا رہا ہوں۔ ٹوٹنے کے وقت کی صدا تو اب بھی دل کے کسی کونے میں گونج رہی ہے۔ یہ کمرہ ہمارے دوست ہربنس ناگی کا تھا جس نے ہماری خستہ حالت کو جانتے ہوئے بہت معمولی کرائے پر ہم کو "بخش" دیا تھا۔ اس کمرے سے کچھ ایسی گہری وابستگی ہو گئی تھی کہ اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے یاد ہے---- میں کمرہ نہیں چھوڑ رہا تھا کہ ناگی نے ساری دوستی کو بالائے طاق رکھ کر تالا توڑ کے کمرے کا "قبضہ" لے لیا تھا۔ آخری مہینے کا کرایہ ابھی بھی میرے سر ہے۔ کمرے کا میرا "قیمتی" سامان شائد ابھی بھی ناگی کے گھر کے کسی کونے میں دھول چاٹتا ہو گا۔

کمرے میں میں پہلے اکیلا رہتا تھا، اپنی سلطنت کا واحد بادشاہ پھر ہم دو ہو گئے---- میں اور ایلین نفسیاتی ہم آہنگی کے مالک! پھر تو کمرہ جیسے ہجوم بنا رہا۔ جسے کہیں ٹھکانہ نہ ملتا، وہ آکر میرے کمرے میں ٹک جاتا۔

کمرے میں کیا تھا؟---- خارجی نظروں کو لگتا تھا جیسے کمرے میں کچھ نہیں

ہے۔ مگر میں جانتا تھا گویا کسی غار میں اتر رہے ہوں۔ پھر آگے نلکہ تھا اور نلکے کے پاس اینٹیں رکھ کر بنایا ہوا چولہا تھا جو چائے بنانے یا "عیش" کرنے کے لئے مانس مرغا بھوننے کے وقت مہکتا تھا۔ اک کونے میں سگرٹوں کی خالی ڈبیاں' ردی اخباروں کے ورق' نندے کی دوکان سے لائے گئے "چھولیاں" کے خالی کسورے جو سگریٹ پیتے وقت "ایش ٹرے" کا کام دیتے تھے---- پڑے رہتے تھے۔ نل سے لگا ہوا چھت تک پہنچنے والا زینہ تھا۔ جب زینے سے چھت پر چڑھتے تو ہمارے قدموں کی آواز سن ر پڑوس کی چھتوں پر بیٹھی نوجوان لڑکیاں اپنا "لٹا پٹا" سمبھال کر جلدی سے سیڑھیاں اتر جاتیں۔ ہم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے منہ دیکھتے ہوئے سوچتے---- "کیا واقعہ میں ہم آوارہ لگتے ہیں؟" ان لڑکیوں کا ڈر دور کرنے کے لئے یا یوں کہہ لیجئے کہ اپنے آپ کو شریف زادے ثابت کرنے کے لئے ہم نے ہر حیلہ برتا مگر کامیاب نہ ہوئے۔ آخر میں ان کے چھوٹے بھائیوں سے چھوٹی چھوٹی باتیں کر کے یہ ظاہر کرنا شروع کیا کہ ہم واقعی شریف زادے ہیں۔ کبھی چھت پر جا کر کسی ننے منے کو اٹھا کر کھلاتے۔ اس طرح کی کوششوں سے ان لڑکیوں کا ڈر اور شک ہولے ہولے دور ہو گیا---- اب ہم چھت پر جاتے تو وہ لپک کر نیچے نہ بھاگتیں۔ یہ ہماری عجیب سی جیت تھی جس کا احساس ہمارے چہروں پر بہت دن ٹھاٹھیں مارتا رہا تھا مجھے یاد ہے---- پہلی بار جب ایلین جرات کر کے ان کے ننھے منے کو اٹھا لایا تھا تو پل بھر کے لئے چھت پر بیٹھی ساری لڑکیوں کے چہروں پر ایک دم زردی سی چھا گئی تھی جیسے ان کا معصوم بچہ کوئی چیل اٹھا کر لے گئی ہو۔ کمرے میں آ کر ہم کچی دیر اپنے اس حوصلے اور لڑکیوں کے دلوں کی حالت پر ہنستے رہے تھے۔

ایلین نے ایک صبح اٹھتے ہی---- ابھی چائے بھی نہیں پی تھی کہ اعلان کر دیا کہ پگڑی کو فی الحال "الوداع!" اور وہ سیدھا شیرے حجام کی دوکان پر گیا اور حجامت کروا آیا---- اس کے ہم کو کئی فائدے بھی ہوئے اور کئی نقصان بھی!---- ایک فائدہ یہ ہوا کہ جس پھل فروش سے ایلین ادھار پھل فروٹ لایا

رتا تھا' اس نے پیسے مانگنے بند کر دیئے (ایلین کو وہ پہچان نہ سکا تھا)---- نقصان یہ ہوا کہ ہمارے "ر-سٹل" والے عیش میں رکاوٹ پڑ گئی- جہاں سے ہم دونوں ر-سٹل خریدتے تھے' اس کے لئے اب ہم دو نہیں رہے تھے' ایک ہو گئے تھے- یعنی جلئے سے ایک جیسے ہو گئے تھے- جب میں اپنا کوٹہ لینے جاتا تو وہ کہتا "بھائی صاحب! آپ ابھی تو لے کر گئے ہیں!" کافی مغزمارنے کے بعد اسے سمجھانے میں کامیاب ہوتا کہ وہ میں نہیں تھا- اس طرح کئی بار ہم دونو نے ڈبل کوٹہ بھی حاصل کر لیا-

اس کمرے نے مجھے بہت کچھ سے "نوازا" ہے اور اس نوازش کے آگے میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو جھکا ہوا محسوس کیا ہے- کمرے میں بیٹھنے کے لئے بوریاں پھاڑ کر بنایا ہوا ٹاٹ اور اس پر بچھایا ہوا کھیس جسے دھلوانے کی ہم نے کبھی زحمت نہ اٹھائی تھی- کمرے میں بنا پلوں کے الماری تھی جسے میں نے کھاد کے اشتہار سے سجانے کی کوشش کی تھی- الماری میں ہمارے منی رسالے "یاقوت" کے پرچے ہوتے تھے جنہیں کئی بار بڑی بے کرکی سے چائے بنا-ن کے لئے چلانے کے کام میں لے آتے تھے- کمرے کے کونوں میں ایلین نے کیکر کی کٹیلی جھاڑیاں لا کر سجائی تھیں- پھر ہمارے دوست بلیر نے' شائد ترس کھا کر' اپنے گھر سے ایک چارپائی لا دی تھی اور ہم اپنے تئیں جنت میں محسوس کرنے لگے تھے- ایک عجیب اتفاق ہوا---- انہی دنوں گھر سے بھی ایک رضائی پہنچ گئی- میں اور ایلین ایک ہی چارپائی پر بے سدھ ہو کر گہری نیند سویا کرتے تھے- ایک رات ہم دونو ر-سٹل کا ڈبل کوٹہ لے کر بیدار رہنے کی مشق کر رہے تھے کہ مجھے چائے کی طلب محسوس ہوئی- شب کے دو بجے تھے- باہر بلا کر پالا تھا اور اندر ہم اپنی اپنی رضائی میں دبکے پڑے تھے- انہی دنوں ہمیں ایک ہیٹر دستیاب ہو گیا تھا اور بجلی کا سرقہ کرنے کا ڈھنگ بتلانے والا ایک بجلی والا بھی- ایلین اٹھنے کے ڈر سے مجھے چائے بنانے کے لئے کچوکے دے رہا تھا- آخر میں اٹھا' ہیٹر جلایا اور اسے کھینچ کر چارپائی کے پائے کے ساتھ لگا لیا- پتی' چینی' دودھ ایک ساتھ مصیبت نیڑ کر میں سو گیا- پھر ہمیں پتہ

لگا جب رضائی کے ایک کونے سے لپٹیں اٹھنے لگیں میں اونگھ میں تھا ہی---- اس کونے کو پلٹ کر دوسری طرف کر لیا- اس طرح چارپائی کو چاروں طرف سے آگ نے گھیر لیا- ریسٹل کا نشہ اتنا گہرا تھا کہ مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا تھا- پورا ہوش تب آیا جب ہم دھڑام سے نیچے آ گرے- رضائی اٹھا کر باہر نل کے نیچے رکھ دی اور پورا نل کھول دیا اور ایک بچی ہوئی رضائی لے کر فرش پر سو گئے- کوئی ایک گھنٹے کے بعد پڑوسیوں کی چھت پر شور سنائی دیا---- باہر پڑی رضائی پھر جل رہی تھی اور پڑوسی دھواں اور آگ دیکھ کر شور مچا رہے تھے- دن چڑھ چکا تھا مگر دھند پھیلی ہوئی تھی- میں کوٹھے پر جا کر بڑا ڈھیلا سا منہ بنا کے پڑوسیوں سے کہہ رہا تھا---- "کوئی بات نہیں ہوئی جی' ہم چائے بنا رہے تھے..... لوگ چپ چاپ لوٹ گئے-

ترن تارن کے اس کمرے کے بارہ میں ابھی اور بھی بہت کچھ ہے جو ان کہا رہ گیا ہے---- ریٹا' نیلم' اوشا کی شیریں یادیں ہیں---- اشوک چالڈین اور سرندر راؤ کے قہقہے ہیں---- اور' اور بھی بہت کچھ!

اب میرا اپنا مکان ہے- اس میں ایک میرا اپنا کمرہ' ایک میری اور بیگم کی خوابگاہ' ایک میرا مطالعہ کا کمرہ اور ایک ہمارے غیر مولود بچے کی کلکاریوں کا انتظار کرتا ہوا کمرہ!---- سامنے الماری میں سجائی ہوئی کتابیں ہیں- ایک دیوار پر ٹنگی' ایک دوست کی طرف سے تحفے کے طور پر دی ہوئی ایک پینٹنگ- صبح کے سورج کو پرنام کر رہی عورت کے جڑے ہوئے ہاتھوں کی کیلنڈر نما تصویر' اور..... اور بھی بہت کچھ- لیکن وہ کمرہ اور اس کے ساتھ جڑا ہوا میرا اپنا آپ---- مجھے لگتا ہے' میں ابھی بھی اس گورو بازار والے کمرے کے ارد گرد کہیں بھٹک رہا ہوں---- سچ مچ بھٹک رہا ہوں- مگر ساری بھٹکن میں سکون کی بوند کی آمیزش تب ہوتی ہے جب لہکے گاؤں والا کمرہ آنکھوں کے آگے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے---- جہاں میری "وہ" تھی اور جہاں میرے اعضاء میں جوانی کی پہلی آگ سلگ اٹھی تھی.....

درشن متوا 1953

ہر ماہ کی اٹھارہ تاریخ.... کبھی بیس بائیس.... ایک دو' اور کبھی مہینے کی کوئی تاریخ..... اور ان تاریخوں کا میرے کمرے کے ساتھ کسی دو ملکوں کی سرحد ایسا رشتہ جڑا ہوا ہے۔ یہی تاریخیں ہیں جو کمرے کے میرے اپنے یا بیگانہ ہونے میں ایک لکیر ہیں۔ ان تاریخوں کے آنے سے کچھ دن قبل ہی مجھے یوں لگنے لگتا ہے جیسے یہ میرا اپنا کمرہ نہیں ہے---- اور آنیوالے اگلے ماہ کی ان تاریخوں تک میرے اعصاب پر یہی احساس سوار رہتا ہے۔ کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ جب تک سال کے کیلنڈر میں سے میں ان سب تاریخوں کو نکال نہیں دیتا تب تک کوئی بھی کمرہ میرا اپنا نہیں ہو سکتا۔ میں اس کمرے کی چھت کے نیچے پڑا ہوا بھی بنا چھت کے محسوس کرتا ہوں جس کی چھت صرف آسمان ہے۔ سردیوں کی ٹھٹھرا دینے والی راتوں میں اپنے ہاتھوں سے چھاپی ہوئی کھدر کی رضائی میں دبکے ہوئے بھی میں محسوس کرتا ہوں گویا کسی بڑے شہر کے فٹ پاتھ پر پڑے ننگ دھڑنگ' پالے سے ٹھٹھرے' کالے کلوٹے لوگوں میں سے میں بھی ایک ہوں مجھے رضائی گرمائش نہیں دیتی۔ رات کو نیند نہیں آتی۔ کوئی سپنا نہیں آتا جیسے میری عمر میں سے میری سپنوں کی عمر کے چار برس منفی ہو گئے ہیں۔

تاہم پھر بھی' پتہ نہیں کبھی کبھی کیوں وہ کمرہ مجھے اپنا اپنا لگتا ہے' بالکل اپنے ہاتھ سے خریدی ہوئی بنیائن جیسا جو میں نے پہنی ہوئی ہے---- یہ صرف تب ہی لگتا ہے جب سگریٹ کی طلب لگی ہو' پاس سگریٹ نہ ہو نہ سگریٹ لائق جیب میں پیسے ہوں' کوئی ادھار نہ دے اور اگر کہیں اس وقت اس کمرے کے کسی کونے

میں سے ایک آدھ بجھی ہوئی سگریٹ کا ٹکڑا مجھے مل جائے۔ اس وقت وہ کمرہ مجھے اپنی ماں جیسا لگتا ہے' بچپن میں میں جس کی گود میں لیٹے اس کا دودھ پی رہا ہوتا تھا' یا جب میں اپنی کھڑکی کھولات ہوں تو وہ لڑکی (کوئی بھی ہو) سامنی چھت پر بال سکھاتے ہوئے میری طرف دیکھتی رہے' یا پھر دن ڈھلے جب سارے محلے کی لڑکیاں میرے کمرے کے آگے چرخے ڈال کر باریک باریک تارکات رہی ہوں اور ان میں سے وہ سب سے کمسن' بھولی سی حسین لڑکی میری طرف دیکھ کر نظریں نیچی کرے....

اور ہاں میری داڑھی!---- اس کی بھی اس کمرے سے اتنی ساجھے داری ہے جیسے یہ میرے منہ پر اگنے کی بجائے کمرے کے منہ پر اگ آئی ہو۔ چھوٹی سی گلی میں بہت کم لوگ مجھے جانتے ہیں۔ نام بھی کوئی ہی جانتا ہے' جانتے بس اکا دکا پڑھے لکھے نفوس ہی ہیں یا پھر خاص کر ڈاکخانے والا بابو۔ بس گلی کے لڑکے بچے مجھے داڑھی والا بھائی کہہ کر جانتے ہیں۔ میرے کمرے میں جانے کے لئے میرے نام کی ضرورت نہیں' "داڑھی والے کا کمرہ" پوچھ لیں تو آپکو لگے گا گویا سچ مچ ہی کمرے کے داڑھی اگ آئی ہو۔

مگر میرے کمرے میں کیا ہے؟ یہ بتانا بھی اک عجیب سی پہیلی ہے جیسے کسی ننگے آدمی سے پوچھا جائے' بھئی تم نے کیا پہنا ہوا ہے اور جواب میں وہ سردی سے سکڑتا ہوا ٹکر ٹکر آپکے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔ ایسا مذاق ہی تو میرے کمرے میں آنیوالے کے ساتھ ہوتا ہے---- کرائے کا کمرہ 10x10 سائز' پھر بھی ضرورت سے زیادہ بڑا۔ (اگر کہیں وہ کرایہ کم کر دیں تو 5x5 سے ہی کام چلا لوں) چھوٹی سی چارپائی' اس پر گدیلا' پھر چادر اور پھر رضائی یا کھیس---- اور بھلا کمرے میں کیا ہونا چاہئے؟ ایک کرسی---- وہ مکان مالک کی ہے---- اور میز' یہ بڑی ہنسی کی بات ہے کہ میز کی جگہ مکان مالک نے (پتہ نہیں مجھ پر ترس کھا کر یا فالتو ہونے کی وجہ سے) کڑھائی کی مشین کا نیچے کا میز جیسا سٹینڈ دے رکھا ہے۔ مگر پھر بھی ہر آنے والا متعجب ہو کر اس کی دیواروں کی طرف دیکھے جاتا ہے---- کسی برہنہ آدمی کے کپڑوں کی طرف دیکھنے کی مانند۔ دیواروں پر بنائے ہوئے ٹوٹے پھوٹے سکیچ

کھنچے ہوئے دیکھ دیکھ کر وہ ادھیڑبن میں پڑا رہیگا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ سب فریب ہے جو میں اپنے آپ کو دیئے جا رہا ہوں اور اوروں کو بھی --- وہ بس اکیلے پن کے اور اکتاہٹ کے کچھ ٹکڑے ہیں۔

ایک بانسری پڑی ہے' ایک ڈھولک بھی۔ (ڈھولک کسی کی ہے اور بانسری میری جو مجھے کسی نے رکھنے کے لئے دی تھی) بانسری بجاتے وقت مجھے نہ کمرے کا پتہ ہوتا ہے اور نہ اپنے آپ کا۔ میرا کمرہ جیسے اوپر اٹھنا شروع ہو جاتا ہے' ہوا میں تیرتا ہے' آسمانوں میں جا پہنچتا ہے جہاں بانسری سے نکلنے والی تان سن کر ہیر اپنے رانجھے سے ملنے کیلئے سرپٹ بھاگ پڑتی ہے۔ میں یہ سب کچھ دیکھتا ہوں' جیتا ہوں۔ اسی وقت پتہ نہیں' گلی کی کوئی جوان جہاں لڑکی یا عورت میرے کمرے کی دیوار کے ساتھ کان لگا کر گلی کے لڑکوں کو بانسری سنتے ہوئے شیشکار دیتی ہے (پتہ نہیں' انہیں چلتا کرکے وہ خود کان لگا لگا کر سنتی ہو)

کمرے میں ایک کارنس ہے جہاں کچھ لڑکوں کی اور میری اپنی تصویریں پڑی ہیں۔ ایک سوئی' دھاگے کی ریل اور دو ایک قمیض کے بٹن۔ ایک پلنگ ہے جس پر میری لنگی ہے' نیکر ہے' قمیض ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا' اور کیا کیا گنواؤں؟ ہاں سچ' میرے کمرے کے اندر ایک ریگستان ہے جہاں سسی "پنوں' پنوں" پکارتی ہوئی جھلس کر راکھ ہوگئی تھی۔ یہ ریگ زار میرے کمرے کی دیوار پر تھوڑی سی جگہ میں ہے جہاں ایک بار میں نے خالی بیٹھے پنسل سے کچھ قدموں کے نشان بنا کر وہاں لکھا تھا --- "نازک پیر ملوک سسی دے" مہندی نال شنگارے --- بابو ریت تپے وچ تھل دے' جیون ہنن بھٹیارے!"

اب جب اس ریگ زار پر غور سے نظر ڈالتا ہوں تو دور جیسے میرا "خود" کہیں چلا چلا جا رہا ہو۔ جھلستی ہوئی بھوری ریت پر ننگے قدموں کے نشان چھوڑتا ہوا --- اور وہ نقش پا جیسے سسی کے نہ ہو کر میرے بن گئے ہوں۔ یہ ریگستان میرے پیدا ہوتے ہی میرے پیروں کے نیچے تھا۔ اور تب سے آج تک اسی کا سفر کر رہا ہوں۔ مالم نہیں' کب ختم ہوگا یہ سفر؟ اور اس ریگستان کو سمیٹتے ہوئے یہ کمرہ

یاروں دوستوں کے لئے ایسا ہے جیسے کسی تشنہ ہرن کو پانی کا کنارہ مل گیا ہو۔

اس ہزاروں' اربوں میل پھیلے ہوئے ریگ زار کے برابر ایک الماری ہے۔ اس میں گنتی کی کچھ کتابیں ہیں۔ کسی وقت یہ کافی تعداد میں ہوگئی تھیں' عمدہ عمدہ۔ مگر وہ عمدہ عمدہ کتابیں ہولے ہولے میری الماری میں سے نکل کر اوروں کی الماریوں کی زیوروں کی طرح زیبائش بن گئی ہیں جہاں سے وہ لوٹ نہیں پڑتیں۔ صرف یاد ہی آتی ہیں' سوہنی کے دریا میں ڈوب جانے کی طرح!

الماری کے اوپر کیکر کی تیلیوں اور ٹہنیوں سے بنا اک اور گھر ہے۔ کمرے میں اک دوسرا گھر' چڑیوں کا ننھا گھونسلہ ایک بار میرے ایک دوست نے مجھے ایک تیتے کا گھونسلا لا کر دیا تھا۔ بس میرے سر پر دیوانگی سوار ہوگئی۔ میں اسی وقت باہر کو بھاگا۔ ایک سوکھے کیکر سے تھوڑی سی ٹہنیاں توڑ کر کانٹے جھاڑ دیئے اور انہیں دھاگے سے باندھ کر دیوار میں گاڑی ہوئی ایک کیل پر ٹانگ دیا اور وہ تیتے کا گھونسلہ ان ٹہنیوں پر لٹکا دیا---- آرٹ کا اک عمدہ پیس تیار ہوگیا تھا۔ مگر کچھ ہی روز بعد ایک چڑے اور چڑیا نے تنکا اکٹھا کر کے اس پر اپنی پسند کا گھر بنا لیا تھا۔ تمام دوپہر چڑا چڑی اپنے گھر پر ٹھہرتے' کلولیں کرتے' اور میں اپنی چارپائی پر لیٹا ہوا ان کی کلولیں اور پہلیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ تنہائی جاتی رہی تھی اور دو انوکھے ساتھی مل گئے تھے۔ تاہم ---- تنہائی تو جیسے میری پیدائش کے ساتھ ہی میرے پوتڑوں میں میرے ساتھ ہی لٹا دی گئی تھی---- ایک دن چڑیا نیچے فرش پر مری پڑی تھی۔ اس روز کے بعد میں نے اس چڑے کو اس گھر میں نہیں دیکھا۔ اس اجڑے ہوئے' ویران گھر کو دیکھ کر مجھے ایک شعر یاد آیا اور میں نے اس گھونسلے کے پاس دیوار پر لکھ دیا۔

نہ گل اپنا' نہ خار اپنا' نا ظالم باغبان اپنا
ہائے بنایا کس گلشن میں ہم نے آشیاں اپنا

کمرے کے ایک کونے میں صراحی رکھی ہے۔ سترماؤل!---- آجکل اس کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ مٹی سے بھری پڑی ہے۔ جوانی میں یہ نہانے کے کام

بھی آتی تھی اور پانی پینے کے بھی۔ گرمیوں میں یہ دوست احباب کے لئے "منی فرج" کے برابر ہوتی تھی۔ پاس ہی ایک پیتل کا گلاس رکھا ہے جسے اس کی ساری عمر میں یاک یا دو بار ہی مانجا ہے۔ پتہ نہیں' اس کے ساتھ کیا لگاؤ ہے کہ رگڑنے کو دل ہی نہیں کرتا۔ مگر اس نے سب طرح کا ذائقہ دیکھا ہے۔ پانی کا' دودھ کا' چائے کا' شراب کا۔۔۔۔ اور اب کبھی گورچرن چاہل بھیکھی میرے کمرے میں آتا ہے تو یہ گلاس اس کے عزیز دوستوں جیسا ساتھ اور گرمائی دیتا ہے۔۔۔۔ اور کمرے میں بس اور ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ویسے یار لوگ یہ ضرور کہتے ہیں کہ دوست! تمہارے کمرے میں کیا آگئے' مکہ کا حج کر لیا۔ پہلے مجھے یہ ایک بھدا مذاق لگتا تھا۔ مگر جس دن سے ایک دوست دیوار پر ایک شعر کنندہ کر گیا ہے' میں سب کچھ کے معانی جان گیا ہوں۔

وہی ہے مرکز کعبہ' وہی راہ بت خانہ
جہاں دیوانے دو مل کر صنم کی بات کرتے ہیں

بس جیسا میرا کمرے کے بارے میں تصور تھا' کمرہ مل گیا۔ مگر کاش! تاریخ کے کیلنڈر میں سے ساری تاریخیں کم ہو جائیں۔۔۔ اور ان تاریخوں کے باعث کبھی کبھی مجھے وہ کچی کوٹھڑی یاد آتی ہے۔ جس میں میری بوا نے مجھے پہلی گھٹی دی تھی' جس کی کچی چھت میں کہیں کہیں پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ بارش کے دنوں میں جس کی چھت پر پاؤں کی ایڑھی دھنس جاتی تھی اور گڑھا سا پڑ جاتا تھا' جہاں کہ میں اپنی ماں سے چمٹا پڑا اس کی چھاتیوں کو دودھ پینے کے لئے ٹٹول رہا ہوتا تھا۔ کاش!۔۔۔۔ کبھی وہ کچی کوٹھڑی اور وہ کچی عمر کے دن پھر لوٹ آئیں۔۔۔۔!